انتخاب افسانہ

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۴۱۷

انتخاب افسانہ

اترپردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

انتخاب افسانہ

مجلس مشاورت

پروفیسر محمود الٰہی۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن۔ پروفیسر قاضی عبدالستار
پروفیسر سید محمد عقیل رضوی۔ پروفیسر حکم چند نیر

آٹھواں ایڈیشن : ۲۰۰۲ء
تعداد : چار ہزار
قیمت : گیارہ ۱۱ روپے

ایس۔ سی۔ ورما، سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی نے میسرس ناردرن آفسیٹ پریس، ٹکیت رائے تالاب، موہان روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

اردو کی ترقی و ترویج میں بشمول دیگر منصوبوں کے یہ بات بھی خصوصیت کی حامل رہی ہے کہ معیاری کتابوں کی اشاعت و طباعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے اس فرض کو بخوبی ادا کیا ہے اور اس میدان میں آج بھی وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود کبھی غافل نہیں رہی ہے۔ اکادمی نے جہاں ادب کے دیگر موضوعات کے تحت نادر و نایاب مطبوعات کی اشاعت سے قاری کا دل جیتا ہے وہیں مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں شامل تدریسی کتب کو چھپوا کر طلبا کی ضرورتوں کو بھی کافی حد تک پورا کیا ہے۔ یعنی اکادمی نے نصابی کتب کو لاگت سے کم قیمت پر فروخت کر کے ایسی راہ استوار کر دی ہے کہ طلبا انھیں خریدتے وقت بار محسوس نہ کریں۔ قلیل مدت میں ایسی کتابوں کے متعدد ایڈیشن فروخت ہو جانا اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

زیر نظر کتاب کا یہ ایڈیشن اس امید کے ساتھ پیش ہے کہ طلبا و دیگر قارئین حسب سابق اسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

محمد شاہد اللہ خاں
چیرمین
مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
مارچ ۲۰۰۲ء

ترتیب

پریم چند

بڑے گھر کی بیٹی

(۱)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی، جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی، کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کی نذر کی اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سری کنٹھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہادر سنگھ دوہرے بدن کا سجیلا نوجوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ ان سے بالکل متضاد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انھوں نے دو انگریزی حروف بی۔ اے پر قربان کر دیا تھا۔ انھیں دو حرفوں نے ان کے سینے کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقتِ فرصت طب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے سے اکثر کھرل کی خوشگوار پیہم صدائیں سُنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مدّاح نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شد و مد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے اور ہر روز خود کوئی نہ کوئی روپ بھرتے۔ انھیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔

ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پُرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا۔ خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اُسے وہ ملک اور قوم کے لئے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انھیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انھیں اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔ خود انھیں کی بیوی ان سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس سسر دیور جیٹھ سے نفرت تھی بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالی شان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن، بہلیاں، شکاری کتے، باز، بحری، شکرے، جرے، فرش، فروش، شیشہ، آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں وہ ان سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل حوصلہ مند آدمی تھے مگر قسمت کی خوبی لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو تین شادیاں انھوں نے دل کھول کر کیں مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں، ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اسے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا کہ اسے اپنے آپ کو بد قسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس کسی چندے کے لئے روپیہ مانگنے آئے۔ شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور طریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھیں ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا کیا ذکر۔ کوئی سجی ہوئی خوبصورت بہلی تک نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی مگر یہاں باغ کہاں۔

مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ زمین پر فرش، نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنالیا گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغیاں لیے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا، جلدی سے گوشت پکادو مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی، کفایت شعاری کا سبق اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے "دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"

آنندی۔ "آج تو کل پاؤ بھر تھا وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔"

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا "میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو!"

عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی "ہاتھی مرا تو بھی نو لاکھ کا، وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔"

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا "جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے۔"

آنندی کو بھی غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی "وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔"

اب تو جوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا تھا۔ کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا "جس کے گمان پر بھولی ہوئی ہو اسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔"

آنندی نے کھڑاؤں ہاتھ سے روکی۔ سر بچ گیا مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا میں ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت مرد کی ذات سے ہے۔ اسے شوہر کی طاقت اور مرد کی ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

شری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسبِ معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں، کچھ نئے مقدمات اور فیصلے بیان کرنے لگے اور سلسلہ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے اور بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا۔ "بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجئے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں، ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا"۔

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے منہ لگیں۔

لال بہاری۔ "وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کمہار نہیں"۔

سری کنٹھ۔ "آخر بات کیا ہوئی؟"

لال بہاری۔ "کچھ بھی نہیں، یوں ہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں، میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں"۔

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا۔ "مزاج تو اچھا ہے؟"

سری کنٹھ بولے۔ "بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آ گیا۔ بولی۔ "جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اُسے پاؤں تو منہ جھلس دوں"۔

سری کنٹھ۔ "اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو کچھ بات تو کہو"۔

آنندی۔ "کیا کہوں قسمت کی خوبی ہے ورنہ ایک گنوار لونڈا، جسے چپراسی گیری کرنے کی بھی تمیز نہیں، مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا۔ بوٹیاں نچوا لیتی۔ اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے"۔

سری کنٹھ۔ "آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں"۔

آنندی۔ "پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر

سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب بیٹھا تو کہنے لگا کہ دال میں گھی کیوں نہیں ہے۔ بس اسی پر میرے میکے کو برا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری۔ اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی تو سر پھٹ جاتا۔ اس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ ہے۔

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے "یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔

آنندی رونے لگی، جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصے پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا۔ انھیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا مگر آنندی کے آنسو نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے " دادا، اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔

یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لیے سری کنٹھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب ان کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور کہتے تم لوگ بیویوں کے غلام ہو، انھیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پرجوش وکیل اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔ " دادا اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔" ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش میں آکر ضبط اور علم رخصت ہو جاتے ہیں۔

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے " کیوں؟"

سری کنٹھ " اس لیے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسروں کا غلام ٹھیرا۔ گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ کڑی بات تو مضایقہ نہیں۔ کوئی ایک کی دو کہہ لے، یہاں تک تو ضبط کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں اور میں دم نہ ماروں۔

بینی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کیا کرتے تھے۔ ان کے

ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہو گیا۔ صرف اتنا بولا "بیٹا! تم عقلمند ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، عورتیں اس طرح گھر تباہ کر دیتی ہیں۔ ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں"۔

سری کنٹھ۔ "اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دعا سے اتنا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندان کو میں نے علیحدگی کی آفتوں سے بچایا ہے مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں کر سکتا۔ آپ یقین مانیے میں اپنے اوپر بہت جبر کر رہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔

اب بینی مادھو سنگھ بھی گرما گئے۔ یہ کفر زیادہ نہ سن کے بولے "لال بہاری تمھارا بھائی ہے۔ اس سے جب کبھی بھول چوک ہو تم اس کے کان پکڑو، مگر...

سری کنٹھ۔ "لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا"۔

بینی مادھو۔ "عورت کے پیچھے؟"

سری کنٹھ۔ "جی نہیں، اس کی گستاخی اور بیرحمی کے باعث"۔

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ کچھ دھیما کرنا چاہتے تھے مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ اور تمباکو اڑانے کے لیے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب یہ سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں تو ان کا دل بہت خوش ہوا اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سننے کے لیے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ حاسد بھی اس گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا تھا۔ اس لیے وہ خطاوار ہے۔ اس نے اتنا علم حاصل کیا یہ بھی اس کی خطا ہے۔ بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں یہ بری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے، یہ ان کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں بر آئیں۔ حقہ پینے کے بہانے سے، کوئی لگان کی رسیدیں دکھلانے کے حیلے سے آ آ کر بیٹھ گئے۔ بینی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے۔ اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں خوش نہ ہونے دوں گا خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجۂ تقریر بہ نرم کر کے بولے "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں، تمھارا جو جی چاہے کرو، اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی"۔

الہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈبیٹنگ کلب میں اس نے

اپنی بات اڑانے کی عادت سیکھی تھی مگر علمی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا۔

"میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ۔ "بیٹا! تم عقلمند ہو اور عقلمند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے اُس سے جو کچھ خطا ہوئی اسے تم بڑے ہو کر معاف کر دو۔"

بیٹا۔ "اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجیے میں اپنا بوجھ آپ اٹھالوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیے کہ جہاں چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا چپ چاپ بڑے بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے، یا حقہ پی لے، یا پان کھالے۔ اپنے باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں انھوں نے کبھی اسے گھڑکا تک نہیں۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مگدر کی جوڑی انھوں نے بنوا دی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے نوجوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو انھوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جاکر اسے گلے سے لگالیا تھا اور پانچ روپئے کے پیسے لٹا دیئے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا کہ دیکھو بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں ان سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں ان کے سامنے کیسے اٹھیں گی۔ اس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلا کر سمجھا دیں گے۔ اس امید کے خلاف آج وہ انھیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اکیلا بلا کر دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اسے ملال نہ ہوتا مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں، لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں گیا اور کوٹھری میں جاکر کپڑے پہنے، آنکھیں پونچھیں، جس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازے پر آکر بولا۔

"بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا منہ نہیں

دیکھنا چاہتے، اس لیے اب میں جاتا ہوں انھیں پھر منھ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو خطا ہوئی اسے معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہو گئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اسی وقت سری کنٹھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور کترا کر نکل گئے گویا اس کے سایے سے پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری کی شکایت تو شوہر سے کی مگر دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الٰہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو پھر میں کیا کروں گی۔ یہ خیال اس کے چہرے کو زرد کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اب میں جاتا ہوں، مجھ سے خطا ہوئی ہے مجھے معاف کرنا، تو اس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا "لالہ باہر کھڑے ہیں بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ۔ "تو میں کیا کروں؟"

آنندی۔ "اندر بلا لو۔ میری زبان میں آگ لگے۔ میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اٹھایا۔

سری کنٹھ۔ "میں نہیں بلانے کا۔"

آنندی۔ "پچھتاؤ گے۔ انھیں بہت گلان آ گئی ہے ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔"

سری کنٹھ نہ اٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ بھابی! بھیّا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا منھ دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس لیے میں بھی اپنا منھ انھیں نہ دکھاؤں گا۔

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "مجھے جانے دو۔"

آنندی۔ "کہاں جاتے ہو؟"

لال بہاری۔ "جہاں کوئی میرا منہ نہ دیکھے۔"

آنندی۔ "میں نہ جانے دوں گی۔"

لال بہاری۔ "میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہوں۔"

آنندی۔ "تمھیں میری قسم، اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔"

لال بہاری۔ "جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے گا کہ بھیّا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا ہے تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔"

آنندی۔ "میں ایشور کی سوگندھ کھا کر کہتی ہوں کہ تمھاری طرف میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔"

اب سری کنٹھ کا دل پگھلا۔ انھوں نے باہر آ کر لال بہاری کو گلے لگا لیا اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بھیّا! اب کبھی نہ کہنا کہ تمھارا منہ نہ دیکھوں گا، اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔"

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "للّو! ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ۔ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔"

بینی مادھو سنگھ باہر سے آ رہے تھے، دونوں بھائیوں کو گلے ملتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اُٹھے۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں۔"

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔

"بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

پریم چند

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بُجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی، اور رہ رہ کر اس کے مُنہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سنّاٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہوگیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو نے دردناک لہجے میں کہا۔ "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جِند گانی کا سُکھ بھوگا اُسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی، جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں

مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے۔ جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے، بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کے لئے بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا تو دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہو گا۔ اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔

"مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں، اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں۔

اسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہو گی مجھے دیکھے گی تو کُھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو ــــ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو کچھ زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔ اس لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی،

اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا —— "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور پیٹ بھر نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوریاں کھائیں اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ۔ ایک رسے دار ترکاری۔ دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا، مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیئے۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے مُنھ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا، مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریادل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے؟ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوریاں کھائی ہوں گی۔؟"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے مُنہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں، سارا جسم خاک میں

لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سُنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسا چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدے پر کام پر نہ آنے کی علت میں، پوچھا کیا ہے بے گھِسوا روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔" سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گُزر گئی، دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں" چل دور ہو یہاں سے، لاش گھر میں رکھ کر سڑا، یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔"
مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی مُنہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو

آنے دئے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپئے کی معقول رقم جمع ہوگئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے، ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آکر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیئے۔

" تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں"۔

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے؟

"کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے"۔

"کپھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے"۔

" اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے"۔

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے، بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہونچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی، کچھ گزک، اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا "کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا"۔

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا، گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں"۔

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کپھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

"بڑی اچھی تھی، بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں، گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا کوئی خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔

"ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہو گا؟"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان! تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی؟"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اُسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔

"کون دے گا، روپے تو تم نے چٹ کر دیے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں۔؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپیے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح بیٹھے پیئیں گے۔ اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی۔ میخانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چلو میں اُلو ہو جاتے ہیں۔ کہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ یا زندہ در گور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے دینے کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ "لے جا۔ کھوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیرباد جرور اُسے پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے، بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا" بیکنٹھ میں جائے گی دادا ۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی "

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا " ہاں بیٹا! بیکنٹھ میں جائے گی ۔ کسی کو ستایا نہیں ۔ کسی کو دبایا نہیں ۔ مرتے وقت ہماری جند گی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی ۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو .... دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں ۔

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا ۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے ۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا ۔ مادھو بولا ۔

" مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا ۔ مری بھی تو کتنا دُکھ جھیل کر "

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا ۔

گھیسو نے سمجھایا " کیوں روتا ہے بیٹا ۔ کُھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی ۔ جنجال سے چھوٹ گئی ۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے "

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے ۔

" ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے ٹھگنی "

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے ۔ پھر دونوں ناچنے لگے ۔ اُچھلے بھی کودے بھی ۔ گرے بھی ۔ مٹکے بھی ۔ بھاؤ بھی بتائے ۔ اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے ۔

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سنی نہیں کہتا آنکھوں دیکھی کہتا ہوں کسی بدیسی واقعے کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے، رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے جنو اور منو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا۔ اور دادا یہاں سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی نے کچھ اور بھی کام لیے۔ اور نتیجے میں ہاتھ آئے جنو اور منو۔ وہ تو یادگار چھوڑ کر جنت کو سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انھوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور جنو منو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیے۔ وہ دونوں پلے بڑھے۔ اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ جنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا۔ امیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انھوں نے جنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باندھ دیا۔ مگر منو منہ چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی، ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انھوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی، سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔

"اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنّو کی طرح اسے کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا ہے۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انھیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل وصورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی اس درزی کی حرکات سُن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی۔ اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا___

"اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمھارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نو وارد کی خبر دی۔ ایک صاحب جو ذرا ظریف بھی تھے اس کی تاریخ یوں بیان کی:۔

"راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔ خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔

اِس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں! وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آ گئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اُسے معصیت کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنّو منّو کی نسل اور نہ بڑھے؛ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منّو کی ماں کو بلوا کر انھوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منّو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو، کل اس کا عقد ہو گا۔"

بے چاری جولاہن کو چوں و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کر ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی۔ اس لیے بہت کھل کر باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی کہ میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انھیں کا دیا ہوا ہے۔ چنّو کی نوکری انھیں کی عطا کردہ ہے۔ اور منّو کی جوت میں کھیت بھی انھیں کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اُٹھائیں گے۔ غرض وہ گھر آئی اور رات کو اس نے منّو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منّو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دُلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منّو کی ماں کو دیے اور ان کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے۔ مہینے ہوئے، پھر سال ہونے کو آیا۔ مگر منّو اور ان کی دُلہن کی کوئی شکایت سُننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے۔

اچانک ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منّو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ پر کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح نشہ وہ بیوی پر اتارتا ہے۔ اُسی طرح غصّہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے صرف مارا ہی نہیں بلکہ اُسے کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔

اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بُری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے "مامتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انھوں نے حکم دیا: "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منّو کی فکر ہوگئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سفید ہو جاتا ہے۔ اس لیے اُسے بُلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سُنا کہ تو نے تاڑی پی ہے تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے پاس کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منّو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض کہ منّو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ـــــ اور تاڑی بند ہوگئی۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا ـــــ

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا آم بن گیا۔ اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عبادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگی ہیں ـــــ اور منّو کی بہوتے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے ہیں تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے کلّہ بہ کلّہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو ہاتھا پائی تک کی نوبت پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا کیا مقابلہ تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہوگئی۔ منّو جھپٹ کر پلنگ سے اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمار داری میں مشغول ہوگئیں لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا سا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اس پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تک تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی۔ دفعتہً چنّو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جَن کر دیور کے پاس چلی

گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا۔ اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواد ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقعے سے چنّو غم بھلانے اور جی بہلانے کے لیے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ دردِ دل بیان ہوئے۔ تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اُس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سُرخروئی سے ہوئی تو چنّو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شروع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اُس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فوراً فتویٰ صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحث کرتی رہیں۔ پھر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل اے گھر چل ـــــ! مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے۔ میں خوش میرا خدا خوش!" ـــــ چنّو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دی اور اپنے چاروں بچّے سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بتیا، دو مہینے بیتے، تین مہینے بیتے۔ مگر چوتھے مہینے چنّو کی کمر میں چک آ گئی۔ اکڑنا، بررنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ میرے صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب طبیب تھے۔ ان کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دنوں اور چلا۔ بدقسمتی میں حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنّو کی کمر کچّی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں کافی سُرور آیا، مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی چُھپیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی۔ اور یہ چیزیں چار روپے کی کمائی میں کہاں نصیب۔ وہ لگا کھیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور پیٹیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھا دیں سماتا۔ اور افیون کی لت پڑ چکی تھی، وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنّو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے، اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی

والے تھے کہ چنّو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ دلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں، ارے ماں" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بہری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔

بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چنّو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:۔

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنّو کی فاتحہ کے تیسرے دن اُس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ، گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔

علی عبّاس حُسینی

نور و نار

"آپ جو جی چاہے سمجھیں! گاؤں والے جو دل میں آئے کہیں! مگر میں اس پاجی کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں گا! ہرگز ہرگز نہ پڑھاؤں گا! میرا داماد سہی، مگر تھا وہ زانی، شرابی اور جواری۔"

مولانا اجتبیٰ نے سمدھی کو ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے جواب دیا اور گھر کا دروازہ دھڑاک سے بند کرلیا۔ اس دھڑاک نے گویا مولانا کے جواب پر مُہر لگادی۔ اب اس پر نظر ثانی کی کوئی امید نہیں رہ گئی۔ سمدھی نے حسرت سے بند دروازے کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے گردن جھکائے نکل گئے۔

مولانا اجتبیٰ کے لیے بھی یہ فیصلہ کوئی آسان امر نہ تھا۔ اپنے ہی داماد کے جنازہ پر نماز پڑھانے سے انکار اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ آس پاس کے کسی گاؤں میں نماز پڑھانے والا نہ ہو، اخلاق، مروّت، انسانیت، عزیزداری، برادری کی تمام روایتوں کے خلاف تھا۔ مگر کیا کریں، خدا کے سامنے کھڑے ہو کر کیسے کہیں کہ اس مُردے کے بارے میں اچھائیوں کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے! وہ اپنے داماد کے کرتوتوں سے واقف تھے، وہ گاؤں والوں کو گواہ بنا کر ایسا سفید جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ سب ہی تو جانتے تھے اظہر کو۔ پولیس کا داروغہ، رشوت، بے ایمانی، جھوٹ، شراب، جوا، عیاشی۔ کون سا عیب تھا جو اس میں نہ تھا۔ اور اس پر سمدھی صاحب کی یہ خواہش کہ اسی پاجی اظہر کی نماز جنازہ پڑھادو! گویا اُس کی ساری بُرائیوں سے مُکرد اور اچھائیوں کا اقرار کرو۔ خدا کے سامنے دیدہ دلیری سے جھوٹ بولو۔ ہُونہہ!

مولانا کا لمبوترا چہرہ سُرخ تھا۔ اُن کی داڑھی کے سفید بال کھڑے تھے اور

ان کا چھریرا جسم جو ایک چھڑی کی موٹھ کی طرح آگے سے جھکا تھا، اس وقت کانپ رہا تھا۔ وہ سمدھی کو مایوس جاتے دیکھ کر دروازے کی کنڈی بند کر کے پاؤں پٹکتے اندر چلے آئے۔

ان کا گھر بہت بڑا نہ تھا۔ چھوٹا سا کچّا صحن، اتّر رخ کے دالان، اندر دالان، پچھم طرف باورچی خانہ، اور پورب جانب دو کوٹھریاں۔ دکن کی طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ دیوار سے ملی ہوئی زمین کو دو فٹ کی لمبان چوڑان میں گوڑ کر دھنیا اور پودینہ لگا رکھا تھا۔ اسی مزروعہ کے پاس کاٹھ کی گھڑونچی پر دو مٹی کے گھڑے کٹوروں سے ڈھکے رہتے تھے اور ایک چھوٹی سی چوکی پر دو تانبے کے بدقلعی جگہ جگہ سے پچکے ہوئے لوٹے، باہری دالان میں تختوں کے چوکے پر بچھایا ہوا فرش بچھا تھا جس پر دیوار سے لگا ہوا ایک گاؤ تھا۔ میلا چکٹ، دونوں پہلوؤں سے روئی کے پھونسڑے جھانکتے ہوئے گاؤ کی بغل میں دری کی ایک جانماز تھی اور اوراد و وظائف کی کچھ کتابیں۔ اور ایک کاٹھ کا فیض آبادی قلمدان۔

اندر والے دالان میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس کا باندھ جگہ جگہ سے مجروح تھا۔ اور اس کی ادوائن ہر بالشت پر گرہ دار۔ اسی کے سرہانے پرانی دری میں لپٹا ہوا مولانا کا بستر رکھا تھا۔ وہیں ایک کونے میں الگنی پر ایک تہمد لٹکتی تھی، ایک پیوند لگی قبا اور ایک بڑی مُہری کا مارکین کا پائجامہ، پلنگ سے ملی ہوئی ایک تپائی پر ایک فیض آبادی زیور رکھنے والا صندوق رکھا تھا، جس پر جزدان میں لپٹی چند کتابیں تھیں اور سب سے اوپر قرآن!۔

مولانا دالان والے تخت پر اس طرح آکر بیٹھے کہ اس کا جوڑ جوڑ بولنے لگا۔ مگر انھوں نے اس کی فریاد پر دھیان نہ دیا۔ انھیں اس وقت غصّے میں کچھ نہ سُنائی دیتا تھا۔ مرنے والا ان کی اکلوتی لڑکی ذکیہ کا شوہر تھا۔ وہ کوئی غیر نہ تھا۔ وہ اپنا ہی تھا اسی لیے تو انھیں اس کی ساری حرکتوں کی خبر تھی۔ رحیمن نے انھیں ایک ایک بات بتادی تھی۔ وہ کبھی بھی اس بدمعاش اظہر کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ان کی ذکیہ کو طرح طرح کے دُکھ پہنچائے۔ اس کے سینے پر مونگ دلی۔ اس کے ہوتے رنڈی گھر میں بٹھائی۔ شراب پی، جوا کھیلا، اپنی ہی پونجی نہیں بلکہ ذکیہ کے

سارے زیور بھی چوروں کی طرح چرا کر جوئے میں ہار دئے! انھیں ظلموں نے تو ذکیہ کو بیمار ڈال کر عین جوانی میں دق کا شکار بنا دیا۔ اور ذکیہ کے مرنے نے مولانا کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا، جھکا دیا، بالوں سے سیاہی آنکھوں سے نور چھین لیا۔ ذکیہ ہی تو ان کی سب کچھ تھی۔ ساری پونجی، ساری خوشی، ساری امیدیں، فقیر کے گھر کا دیا، اس کی زندگی کا اجالا۔ ذکیہ کے بعد ان کی زندگی کیا تھی، بالکل ایک بھول بھلیاں کہ بھٹکتے پھرو، نہ سرے کا پتہ، نہ منزل کی خبر۔ راستے میں نہ جلتا چراغ، نہ روشن مشعل، نہ چھٹکی چاندنی، نہ جگمگاتی کرن۔ بس ایک ہڈیاں ٹھٹھرانے والی ٹھنڈک اور گھور اندھیرا۔

اور مولانا اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اور اُن کا خون کھول رہا تھا، ان کے دل میں نہ جانے کتنی مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ اس مردود اظہر سے اپنی ذکیہ کا بدلہ ضرور لیں، اسے کسی موقع پر پورے گاؤں کے سامنے ذلیل و رسوا کریں۔ افسوس کہ اس کی بیماری اور موت نے اس کا موقع نہ دیا۔ لیکن آج جب کہ کانٹا ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے پہلو میں کھٹکتا رہ گیا۔ سمدھی صاحب اصرار کر رہے ہیں کہ اسی اظہر کی نماز جنازہ پڑھاؤ اور سب کے سامنے جھوٹ بولو کہ یہ نیک تھا، اچھا تھا اور اس نے زندگی بھر نیکی اور بھلائی ہی کی ہے! اس کی صفائی خدا کے سامنے پیش کرو جو اپنی ذکیہ کا قاتل تھا — اور ان کی آنکھوں میں ذکیہ کی صورت پھرنے لگی۔

وہ اس کا بوٹا سا قد، وہ اس کا دبلا جسم، وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، اور وہ اس کا مسکراتا چہرہ! عجب دل پایا تھا۔ اس بچی نے۔ نہ اُسے کھانے کی فکر نہ پہننے کی۔ پیسے ہوں یا نہ ہوں، ہر حالت میں خوش۔ ترکاری گوشت نہ پکا ہو، روٹی چٹنی ہی سہی۔ ایک ہی وقت کھانا ملے کوئی عذر نہیں۔ نوکرانی گھر میں ہوئی تو اس کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہی، نہ ہوئی سارا کام خود کر ڈالا۔ جب باپ کے سامنے دسترخوان لگاتی تو اس انداز سے کھلاتی اور کھاتی کہ معلوم ہوتا کہ صرف دال روٹی ہی سامنے نہیں ہے بلکہ انواع اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر چنی ہیں۔ اور مولانا کے لئے ہر نوالہ لذیذ سے لذیذ تر بن جاتا۔ وہ خوش ہو کر کہتے "ذکو تو یقینی حور ہے" اور وہ بڑی

سادگی سے کہتی۔ "ابّا جان، میں ایسی خوش قسمت کہاں۔ پر خدا کا شکر ضرور ادا کرتی ہوں کہ آپ کو میری پکائی ہوئی ہر چیز پسند آتی ہے؟"

اور مولانا اپنی تربیت و تعلیم پر خود عش عش کرنے لگتے۔ وہ سوچتے دماغ اور دل میں فرق ضرور ہے۔ انھوں نے مذہب کو دماغ کے ذریعہ سمجھا تھا۔ ان کی کتابوں میں یہی لکھا تھا، ان کو تعلیم بھی دی گئی تھی اور ان کی فکر بھی یہی کہتی تھی، اس لئے مجبوراً مذہبی احکام مانو۔ مگر دل نے ہمیشہ بغاوت کی۔ جَو کی روٹی میں وہ مزہ کیسے ہو سکتا ہے جو شیرمالوں میں ہے۔ سادے چاول اتنے خوش ذائقہ کیسے ہو سکتے ہیں جیسی کہ بریانی ہوتی ہے۔ مارکین اور گاڑھے کے پہننے میں جسم کو وہ آرام کہاں مل سکتا ہے جو مخمل اور ریشم میں ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے گھر کی صفائی کرنے اور کھانا پکانے میں وہ راحت کہاں جو ماما دائیوں سے کام لینے میں ہے۔ لیکن ذکو نے مولانا ہی کی زبانی سُنی سُنائی باتوں کو دل میں گرہ کر رکھا تھا، اس نے مذہبی احکام کو اس طرح اپنایا تھا کہ وہ اسکی طبیعت، اس کا مزاج بن گئے تھے۔ وہ انھیں کے سانچے میں ڈھل گئی تھی محسوس ہوتا کہ مذہب کی روح نے ذکو کی صورت میں جنم لیا ہے۔

اس طرح کی بچی اور بیاہ دی گئی اظہر جیسے رندلا مذہب سے۔ عزیزوں نے اصرار کیا تھا کہ کھاتا پیتا گھر ہے، لڑکا کماتا ہے، پولیس کا داروغہ ہے، خوش مزاج ہے، جانا بوجھا ہے۔ ذکیہ کو خوش رکھے گا — مگر.... مگر.... !"

اور مولانا پنجڑے میں بند شیر کی طرح ٹہلنے لگے۔ ان کی نظریں اپنے غصہ کا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ کوئی ایسی چیز جسے توڑ پھوڑ کر، جسے پھاڑ کر، جلا کر وہ اپنے دل کا بخار نکال سکیں۔ اور ان کی نظر اُن چیزوں پر جا کر رُکی جو اظہر نے اپنی زندگی سے مایوس ہونے پر ذکیہ کی یادگار کے طور پر ان کے پاس بھیج دی تھیں۔ کاٹھ کا صندوق، جہیز میں دی ہوئی وظائف کی کتابیں اور جزدان میں لپٹا ہوا قرآن۔ جب سے یہ چیزیں آئی تھیں مولانا نے انھیں کھول کر نہ دیکھا تھا کہ ان میں کیا رکھا ہے۔ وہ تیز قدم رکھتے ہوئے ان چیزوں کے قریب گئے۔ اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے قرآن اٹھا کر بستر پر رکھا پھر انھوں نے

اوراد و وظائف کی کتابیں اٹھا کر ایک ایک کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک کتاب کے آخر میں چند صفحے سادے لگے تھے۔ ان پر ذکیہ کے ہاتھ کی تحریر دکھائی دی۔ معلوم ہوا آنکھوں میں سوئیاں سی چُبھنے لگیں۔ مولانا نے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ان کی سوکھی انگلیاں مُڑے ہوئے کاغذ کے کونے اسی طرح درست کرتی رہیں جس طرح ماں سوتے ہوئے بچّے کی زلفیں سنوارتی ہے اور خود ان کا جسم اس طرح ہلتا رہا جیسے وہ پالنے میں کسی کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ پھر انھوں نے سینے میں کھٹکتی ایک سانس لے کر آنکھیں کھولیں اور ذکیہ کی تحریریں پڑھنے لگیں۔

"میرے نکاح کو آج تیسرا دن ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو جسمانی اذیت پہنچانے میں اپنے کو خوشی کیسے محسوس ہوتی ہے اور لوگ اس تقریب کو شادی کیوں کہتے ہیں"۔

میرے سرتاج نوکری پر گئے۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا انھیں کیا پسند ہے، کیا ناپسند۔ میں پہلے ہی دن سے برابر دُعا کر رہی ہوں کہ خدا مجھے انھیں کی پسند کا بنا دے! خواہ اس میں مجھے کتنی ہی اذیت پہنچے۔

لوگ ساس نندوں کو بُرا کہتے ہیں۔ میری ساس نندیں تو مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی وہ مجھ ہی سے لینا چاہتی ہیں۔

ابا جان کو آج کل کون کھانا کھلاتا ہوگا؟ کلو شام ہی کو چلی جاتی ہوگی، اور وہ کھاتے ہیں رات گئے۔ انھیں گرم روٹیاں کیسے ملتی ہوں گی؟ کچھ نہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اپنا دوسرا نکاح کر لیں۔ بیٹی نہ ہو تو بیوی ضرور ہونا چاہیے"۔

مولانا نے رک کر ایک لمبی سانس بھر لی۔ وہ تھوڑی دیر فضا میں گھورتے رہے۔ پھر انھوں نے ڈائری کے کئی ورق سرسری نظر ڈال کر پلٹ دئے ——

شروع شروع میں دو دو چار چار جملوں میں بات کہہ دی جاتی تھی۔ اب پورے پورے صفحے رنگے ملنے لگے۔ گویا ابتدا میں زندگی کے کنارے پر پیرا کی کی مشق کی جاتی تھی۔ پیرنے والی دو چار ہاتھ مارتی اور تھک کر پلٹ آتی۔ مگر اب وہ زندگی کی گنگا میں بھرپور اُتر گئی تھی۔ دھارے کے خلاف بہت دور تک پیرتی ہوئی جاتی مگر ہمت کے بازو شل نہ ہوتے۔

مولانا کی نظر دفعتہً ٹھٹھکی۔ اس نے لکھا تھا:

"رحیمن کو اور مجھے چچا جان تھانے پر پہنچا گئے۔ میرے سرتاج نے ہماری بالکل اسی طرح پذیرائی کی جس طرح کوئی امیر کسی بڑی دعوت میں پلاؤ قورمہ کھانے کے بعد کسی غریب عزیز کے ہاں سے ٹھنڈی پوریوں کا حصہ اُتارتا ہے۔ واپس بھی نہیں کی جاتی ہیں، کھائی بھی نہیں جاتی ہیں۔ بس کسی چھینکے پر ڈال دی جاتی ہیں کہ پڑی سوکھیں!

عموماً چند گھنٹے بعد چلے گئے۔ وہ بھلا بھتیجی کی سسرال میں کیسے ٹک سکتے تھے۔ ان کو میری خوشی سے زیادہ اپنے دیہات کے رواج کا خیال تھا۔ اب یہ جو چچا جان کو اوپر بھیجنے گئے تو دس بجے رات تک نہ پلٹے۔ نہ جانے کون سا کام نکل آیا۔ رحیمن سفر کے تکان سے چور تھی۔ میں نے اُسے کھلا پلا کر سُلا دیا۔ مگر خود انگیٹھیوں پر پتیلیاں رکھے بیٹھی رہی۔ جب ساڑھے دس بجے اندر آئے تو مجھے پتیلیوں کے پاس اکیلے بیٹھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ میں نے گرم گرم کھانا سامنے رکھا تو پوچھا۔ "تم نے کھایا؟"

میں نے کہا۔" میں آپ کے پہلے کیسے کھا لیتی"!

جواب میں انھوں نے عجیب بات کہی، میں خاک نہ سمجھی۔ وہ بولے "اچھا یہ رنگ ہیں بھئی، یہ رنگ!"

رحیمن دین ایمان کی باتوں سے بہت کم واقف ہے۔ آج مجھے اُسے ٹوک کر کئی باتیں بتانا پڑیں ــــ

باہر کچھ شور سا ہو رہا تھا، وہ جھٹ باورچی خانہ سے نکل کر دروازہ کھول کر

جھانکنے لگی۔ میں نے کہا۔" رحیمن باہر نہ جھانکو۔ جھانکنے تاکنے کو بُرا کہا گیا ہے۔"

وہ بولی۔" بٹیا، تم نے تو آنکھیں ہوتے انھیں بند کر رکھا ہے۔ اب کیا میں بھی تمھاری جیسی ہو جاؤں، کچھ نہ دیکھوں؟"

میں نے کہا۔" بوا میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کے لیے بنی ہیں وہ میں سب دیکھتی ہوں۔ خود بنانے والے نے حکم دیا ہے اُن چیزوں کو مت دیکھو جو دوسرا چھپانا چاہتا ہے۔ جھانکنے والا کبھی اچھی چیز نہیں دیکھتا۔ نیکی ڈنکے کی چوٹ کی جاتی ہے۔ بدی ہمیشہ اوٹ میں کی جاتی ہے۔ تم جھانک کر دیکھو گی تو کبھی خوش نہ ہو گی۔"

رحیمن میری باتیں تو پی گئی اور اس نے اپنی مشک کا دہانہ کھول دیا۔" بی بی، تم نہ جھانکو نہ تاکو، نہ دیکھو نہ سُنو، نہ ٹوکو نہ بولو اور میاں ہیں کہ اُلٹ کر پوچھتے بھی نہیں!"

مجھے رحیمن کا یہ طعنہ بہت بُرا لگا۔ مرد اگر ہر وقت بیوی ہی کا مُنہ دیکھے گا تو وہ دُنیا میں کام کر چکا۔ میں ان کو اس طرح کا "بے کار" آدمی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کو دس کو حلقے میں مجرموں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ مقدموں، فوجداریوں، چوریوں، ڈاکوں میں تفتیش کرنا پڑتی۔ بارہ گھنٹے، سولہ گھنٹے وردی پہنے، بیلٹ کسے ڈیوٹی دینا پڑتی۔ بھلا ایسے میں وہ ہر وقت میرے پاس کہاں بیٹھے رہتے، اس لیے میں نے ذرا تیکھے پن سے کہا۔" بوا مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ جیسا ایک میاں کو ہونا چاہیے ویسے ہی وہ بھی ہیں۔ میں نے اس کے پہلے کوئی بیاہ نہیں کیا کہ مجھے شوہر کے برتاؤ کے متعلق کوئی تجربہ ہو۔" میں یہ بھول گئی تھی کہ رحیمن اس وقت تک چار نکاح کر چکی تھی اور اب چونڈا پکنے پر بھی پانچویں کی تاک میں تھی۔ میں نے سادہ دلی سے ایک حقیقت بیان کر دی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے رحیمن کے مرچیں سی لگ گئیں۔ وہ تلملا کر بولی۔" اے ہے بھولی بی بی! اتنا تو آپ بھی جانتی ہی ہوں گی کہ بیوی کے رہتے سہتے رنڈی نہیں رکھی جاتی، جو آپ کے میاں جھمی جان کو گلے کا ہار بنائے جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں۔"

نہ جانے وہ کیا سمجھتی تھی کہ چھمی جان کا نام لے کر وہ مجھے آپے سے باہر کر دے گی یا میں سوکن کے ذکر سے بدحواس ہو جاؤں گی، بے ہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ اس لیے کہ اس نے یہ فقرہ کہہ کر مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس نے بڑا تیر مارا۔ میں سچ کہوں مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

"ایک تو سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہیے۔ صحیح وہی چیز ہے جو اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سو نہ تم نے دیکھا نہ میں نے......"

وہ بھونچکی ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "بوا! اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ خدا و رسول کا حکم بھی ہے کہ اگر کسی پر تہمت دھری جائے تو اس پر یقین نہ کرو۔ پھر میں کہتی ہوں اگر یہ سچ بھی ہے تو انھوں نے چھمی جان سے نکاح کر لیا ہوگا۔ اختیار ہوتے وہ گناہ کیوں کرنے لگے۔"

رحیمن سر ہلاتی باورچی خانہ میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "بیوی! میں تم سے ہار گئی۔"

میں کچھ نہ سمجھی کہ میں نے اس میں ہار جیت والی بات کون سی کہی۔ میں نے وہی کہا جو مذہب کا حکم ہے۔ خیر، مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے رحیمن کو آج کچھ دین و ایمان کی باتیں بتا دیں۔

آج عجیب واقعہ ہوا۔ کوئی گیارہ بجے رات کو دو سپاہی انھیں سنبھالے ہوئے ڈیوڑھی پر لائے۔ رحیمن کو آواز دی، پردہ کرواؤ، داروغہ جی کو اندر لائیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ! کیا بات ہوئی جو آج سپاہی ان کو اندر لا رہے ہیں، کہیں چوٹ کھائی، کسی بیماری سے بیہوش ہیں کیا بات ہے۔ کس سے پوچھوں کیا کروں۔ رحیمن "ٹانگ پسارے" خراٹے لے رہی تھی۔ اس کے سر پر کوئی ڈھول بھی پیٹتا تو اس کو خبر نہ ہوتی۔ مجبوراً خود اٹھی، برقعہ اوڑھ کر خود کنڈی کھول دی۔ وہ لوگ جب انھیں پلنگ پر لٹا کر چلے گئے تو میں نے دیکھا۔ سارے کپڑے پہنے بیہوش سے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں نے چاہا جھک کر ان کی اچکن

کے بٹن کھول کر اسے اتار دوں تو ان کے کھلے منہ سے ایسی بو آئی کہ سر چکرانے لگا۔ میں نے سانس روک کر اچکن اتار دی اور جوتا موزہ اتارا، پنڈا چھو کر دیکھا گرم نہ تھا۔ دل کی حرکت بھی ٹھیک تھی۔ ہاں نبض البتہ کچھ تیز چل رہی تھی ۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون سی بیماری ہے۔ پھر خود ہی خیال آیا کہ اگر کوئی خدشے خطرے کی بات ہوتی تو سپاہی ضرور ڈاکٹر حکیم کو بلا لاتے۔ پھر بھی میں رحل پر سے اپنا قرآن اٹھا لائی اور میں نے اس کے پاک ورقوں کی انھیں ہوا دی ۔ اور تحفۃ العوام میں جتنی دعائیں بیماریوں کی لکھی ہیں وہ سب پڑھ کر ان پر دم کر ڈالیں۔ لیکن بدبو سے میرا سر پھٹنے لگا۔ میں نے سوچا ان بیچارے کی کیا حالت ہوگی جو اس وقت بیمار بھی ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے سر میں بہت سا ریڈی کلون لگا دیا۔ اور ان کے کپڑوں میں، تکیوں میں، چادر میں پوری شیشی عطر پوٹ ڈالا۔ رات بھر میں جاگتی رہی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے برے خیالات آتے تھے ۔ بار بار دل کو ڈھارس بندھاتی رہی کہ اللہ موجود ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ وہ جو کچھ کرے گا بہتر ہی ہوگا۔

صبح کو جب وہ اٹھے تو بڑی دیر تک انگڑائی لے لے کر جسم توڑتے رہے۔ میں نے چاہا ہاتھ پاؤں دبا دوں۔ کسل دور ہو جائے مگر انھوں نے ہاتھ رکھتے ہی اسے الگ کر کے کہا۔ "کیا درد اور بڑھانا چاہتی ہو ؟"

میں بھوچکا سی ہوگئی۔ میری ساس نے ہر شام پنڈلیاں دبواتے وقت کہا۔ "جیتی رہو بیٹی، جہاں تم ہاتھ لگاتی ہو جسم کا درد کافور ہو جاتا ہے"۔ وہ اور جٹھانیاں۔ نندیں سب ہی تو میرے ہاتھ کی نرمی، سبکی اور صفائی کی تعریفیں کرتی ہیں۔ مگر ان سب کی پسند بے کار۔ جس کی خدمت کے لئے یہ ہاتھ بنے ہیں۔ ان کو تو نہیں بھاتے۔ ان کے جسم کا درد تو ان سے بڑھتا ہے! مگر قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں وہ اٹھ کر باہر چل دیے۔

جاتے وقت جب وہ رحیمن کے پاس سے گزرے تو اس نے ان کی طرف گھور کر کہا۔ "دولھا میاں شرم تو نہیں آتی"! اور انھوں نے اس کی بدتمیزی پر نہ اسے ڈانٹا، نہ پھٹکا بلکہ سر اور نہوڑا لیا۔ میرا جی چاہا میں رحیمن سے پوچھوں کہ یہ کیا ہے

کی شرم دلائی جا رہی ہے۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! خود تو رات بھر پڑی سوتی رہیں۔ ان کے دشمنوں کی کیسی تو حالت تھی، کیسے بے سُدھ پڑے رہے، نہ دین کی خبر، نہ دُنیا کی۔ اور اس وقت اپنی بے پروائی پر شرمانے کی جگہ ان کو شرم دلانے لگیں۔ لیکن فوراً خیال آیا ہوگا ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ نہیں تو وہ یوں چپ سادھے کیوں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے زبان روک لی۔ مجھے کسی کے بیچ میں بولنے کا کیا حق تھا؟

آج دیوالی کی رات ہے۔ شام سے چاروں طرف مکانوں پر دیے جل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تھانے پر بھی چراغاں ہے۔ مردانے میں بہت سے لوگ آئے ہیں۔ سنتی ہوں کہ آس پاس کے بڑے بڑے زمیندار بھی اکٹھا ہیں۔ آج بڑے کھیل تماشے ہوں گے۔

مجھے صبح ہی حکم ملا تھا۔ آج دعوت کے کھانے پکیں گے۔ میں نے رحیمن کے ساتھ مل کر کوئی بیسیوں طرح کی چیزیں تیار کر دی ہیں۔ مُرغ مسلم، شامی کباب، گولے، سیخ پلاؤ، زردہ، قورمہ، قلیا، مچھلی کا قورمہ، مچھلی کے کباب، جھلی ہوئی روٹیاں، پوریاں، پراٹھے، باقر خانی، بادام کا حلوہ، پستے کی لوزیں، شاہی ٹکڑے، شکر قند کی کھیر، ترکاریوں میں آلو، گوبھی، بھنڈی، شلجم، ٹماٹر، پلول جو اس دیہات میں مل سکا ہے یا شہر سے آسکا ہے، سب کچھ پکا ڈالا ہے۔ کیا معلوم کہ ان کے دوستوں کو کیا پسند ہے۔ اب فکر ہے تو یہی کہ ان تمام نعمتوں میں ان کو بھی کوئی چیز پسند آتی ہے یا نہیں۔ ابّا جان کو میری پکائی ہوئی دال روٹی میں بھی مزہ آتا تھا۔ خدا محنت سوارت کرے اور وہ بھی ایک آدھ چیزیں چٹخارے لے لے کر کھائیں!۔

میں یہ لکھ رہی تھی کہ رحیمن چیخی۔ میں دوڑی کہ کیا آفت آئی۔ وہ صحن میں کھڑی کوس رہی تھی۔ "موؤں کا ہیاؤ تو دیکھو، پولس والوں کا تھانہ ہے، سیکڑوں آدمی باہر کا بھی موجود ہے۔ رات کے ابھی گیارہ بجے ہیں اور ابھی سے لگے ڈھیلے پھینکنے۔

میں نے کہا۔ "کون ڈھیلا پھینک رہا ہے؟"

وہ بولی۔ "چور۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ اس بڑھیا کی بھی کیسی مت ماری گئی ہے۔ بھلا ہمارے ہاں تھانے میں چوروں کا کیا گزر؟ مانا کہ میں جس مکان میں رہتی ہوں اس کے پیچھے کھیت ہی کھیت ہیں اور ادھر کی دیوار بھی کچی اور نیچی ہے مگر سب جانتے ہیں کہ یہ مکان تھانے ہی کا حصّہ ہے اور وہاں چور پکڑنے والے رہتے ہیں۔ چوری کرانے والے نہیں رہتے۔ بھلا کیسے کسی چور کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ ڈھیلے پھینکے۔ یا ہمارے ہاں سیندھ لگائے۔ مگر رحیمن کا اصرار ہے کہ ڈھیلے چوروں ہی نے پھینکے ہیں۔

اس نے کہا۔ "ارے بی بی تم کیا جانو، دیوالی میں چور بھی اپنے دیوتا جگاتے ہیں۔ اگر آج کی رات وہ چوری کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر سال بھر جس جس کو چاہیں مُوس لیں، کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

مجھے یقین نہیں کہ چور بھی دیوی دیوتا کو مانتا ہوگا۔ اگر اسے ان پر یقین ہوتا تو وہ چوری ہی کیوں کرتا۔ ارے جس نے پیدا کیا ہے وہ تو ہر جگہ ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ پھر اس سے کوئی چھپ کر کہاں چوری کرے گا۔ اور چوری کر کے جائے گا کہاں؟ کسی اور نے کوئی جگہ بنا رکھی ہے جہاں اُسے پناہ ملے گی؟ میں جب ان باتوں کو سوچتی ہوں تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ دُنیا کے چونڈے پک گئے، مگر اس میں رہنے بسنے والے اب بھی بچے ہی ہیں اور بچوں ہی جیسی حرکتیں کرتے ہیں۔

ان کی بھی عجیب باتیں ہوتی ہیں جیسے میں اُن سے بھی اپنے روپے پیسے، گہنے پاتے عزیز رکھتی ہوں۔ جو کچھ ہے وہ اُنھیں کا تو ہے۔ میرے بکس میں رکھے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جب میں ان کی، میری جان اُن کی، میرا رویاں رویاں اُن کا۔ تو پھر میری چیزیں میری کیسے رہ سکتی ہیں۔ سب کچھ ان کا ہے۔

لیکن بعض وقت وہ ایسا تکلف برتتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھیں شک ہے کہ میں یا میری چیزیں بالکل ان کی نہیں ہیں۔ رات ہی کی باتیں دیکھے،

ایک مرتبہ تو سو روپئے خود مانگ کر لے گئے۔ دوسری بار گہنوں کا صندوقچہ مجھ سے چھپاکر جو لے جانے لگے تو ایسے گھبرائے کہ گر پڑے۔ مجھے اب بھی ان کی حرکت پر ہنسی آتی ہے۔

ہوا کہ رات کوئی گیارہ بجے جب سب لوگ کھانا وانا کھاچکے تو وہ باہر ہی لیپ، دوستوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ میں نے عشاء نوافل کے ساتھ پڑھی۔ اور سو رہی۔ کوئی تین بجے ہوں گے کہ وہ دبے پاؤں اندر آئے مگر میں آہٹ سے جاگ گئی۔ ان کے چہرہ پر عجیب گھبراہٹ سی تھی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ کوئی جواب نہ دیا بلکہ میرے پلنگ کی پٹی پر آکر بیٹھ گئے۔ میں اٹھنے لگی تو بولے "نہیں تم لیٹی رہو۔"

پھر خود ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے — "تمھارے پاس کچھ روپئے ہیں؟"

میں نے کہا "ہیں، کیوں نہیں؟"

بولے "کتنے؟"

میں نے کہا "پورے ایک سو۔"

کہنے لگے "کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "بکس میں ہیں۔ نکال دوں؟"

بولے "نہیں، کنجی دے دو، میں نکال لوں گا۔"

میں نے سرہانے سے کنجی اٹھا کر دے دی۔ انھوں نے بکس کھولا، روپئے نکالے۔ اور کنجی لئے ہوئے چلے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت مجھے کیسی خوشی ہوئی۔ ابا جان نے جو ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا سلیقہ سکھایا تھا اور کچھ نہ کچھ بچا کر رکھ چھوڑنے کی تاکید کی تھی وہ کیسے موقع پر کام آئی۔ میں نے تھانے پر آنے کے بعد گھر کے خرچ سے دس دس پندرہ پندرہ روپیہ مہینہ کرکے جو بچایا تھا وہ آج ان کے کام آیا۔ ان کو دے کر انھیں خوش کیا، اس سے بہتر میری اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ صبح اٹھتے ہی دو رکعت نماز شکر ادا کرنا طے کیا اور میں سو رہی۔

ایک گھنٹہ بعد پھر آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ مرغ بول رہے تھے۔ جھٹ پٹے سے پہلے کا دُھندلکا تھا، ان کا چہرہ اچھی طرح سے دکھائی نہ دیتا تھا، مجھ پر بھی نیند کی کسلمندی تھی، بولا نہ گیا، میں چٹکی لیتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اس کمرے کی طرف گئے جہاں گہنوں کا صندوقچہ تھا۔ اور اُسے اٹھا کر میرے پلنگ کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے چلے۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی ـــ ہنسی کی بات ہی تھی۔ چھ فٹ کا مردوا جب اپنے ہی گھر میں بلی کی چال چلے، اور اپنی ہی چیز لے جانے میں اس طرح کی حرکت کرے کہ معلوم ہو کہ کسی کی چوری کر رہا ہے تو ہنسی نہ آئے۔ لیکن میری ہنسی بے موقع ثابت ہوئی۔ وہ ایسا گھبرائے کہ سامنے ہی رکھی ہوئی میز اُنھیں نہ دکھائی دی۔ وہ اس کے پائے سے اُلجھے اور صندوقچہ سمیت فرش پر گر پڑے۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میری بے ساختہ ہنسی سے ان کے چوٹ لگی، لیکن جب تک میں یہ کہتی پلنگ سے اٹھوں کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، وہ جلدی سے صندوقچہ اٹھا کر باہر بھاگ گئے! ـــ

میں بڑی دیر تک اُن کے اس بھاگنے پر ہنستی رہی۔ اس بھاگنے کی کیا ضرورت تھی، کیا کوئی شخص اپنی ہی چیز چرا سکتا ہے؟

آج مجھے یقین ہو گیا کہ رحیمن جوان کو طرح طرح سے بدنام کرتی ہے وہ سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔ وہ واقعی بڑے سیدھے سادے شریف انسان ہیں۔ کوئی بدطینت آدمی اپنے کئے پر پچھتاتا نہیں۔ پھر کوئی کتنا ہی بڑا قصور کرے اگر اس نے توبہ کر لی تو پھر تو وہ اتنا ہی گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے جتنا کہ دودھ پیتا گود کا بچہ۔

آج ہی کی بات کو لے لیجئے۔ صبح جو وہ گہنوں کا صندوقچہ لے کر بھاگے تو دس بجے دن تک گھر میں نہ آئے۔ باہر کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے ساتھی ایک ایک کر کے چلے گئے مگر وہ پھر بھی اندر نہ آئے۔ میں نے سمجھا کسی کام میں ہوں گے۔ رحیمن سے کہا۔ "پچھوالو، ناشتہ باہر ہی بھیج دیا جائے یا اندر آ کر کریں گے۔"

مگر وہ تو سیدھی بات کرنا جانتی ہی نہیں۔ اپنے مالک کو بھی ڈانٹنے اور نصیحت کرنے کا اپنے کو حق دار سمجھتی ہے۔ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی اور ڈیوڑھی پر جاکر اُس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شاید وہ اکیلے ہی تھے۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے ڈانٹا۔ "واہ دولہ میاں واہ! آپ یہاں اکیلے بیٹھے مکھی مار رہے ہیں اور وہاں بٹیا ناشتہ لئے بیٹھی ہیں۔

مجھے رحیمن کا یہ انداز بہت بُرا لگا۔ وہ نوکرانی تھی۔ اور وہ اس کے آقا۔ میں بیوی تھی اور وہ میرے سر تاج۔ ہمارا تو کام ہی تھا کہ ہم اُن کی خوشی دیکھیں۔ ان کی فرصت کا انتظار کریں۔ یہی ہماری عین راحت ہے، یہی ہماری جنّت! مگر قبل اس کے کہ میں رحیمن کو ٹوکوں، وہ خود ہی سر جُھکائے اندر چلے آئے۔ ان کی چال اتنی سست تھی کہ جان پڑتا تھا کوسوں کا چکّر لگا کر آرہے ہیں۔ میں نے لوٹے، منجن، صابون، بیسن کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا مُنہ ہاتھ دھو ڈالئے، رات بھر جاگے ہیں، کچھ کھا کر آرام کیجئے!"

مگر وہ کچھ بولے نہیں، مجھے بڑی حسرت سے دیکھا۔ اور اپنے پلنگ پر جاکر گر پڑے۔ میں گھبرا کر جلدی سے پاس پہنچی، انھوں نے کروٹ لے کر مُنہ پھیر لیا۔ میرا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ ہو نہ ہو، مجھ سے کسی بات پر ناراض ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پنڈلی دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ انھوں نے ٹانگیں کھینچ لیں اور مجھے زبردستی پلنگ پر بٹھا کر میری گود میں سر رکھ کر بولے۔ "میں تمھارا قصوروار ہوں، میں نے تمھارے سارے گہنے کھو دیئے۔ مجھے سچے دل سے معاف کردو!"

مجھے ہنسی آگئی۔ میرا مرد بھی کتنا بھولا ہے۔ جیسے وہ گہنے میرے ہی تو تھے۔ انھوں نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے زبردستی متین بن کر کہا۔ "وہ گہنے پہنتی میں ضرور تھی، مگر تھے وہ آپ ہی کے! اگر آپ نے انھیں کسی کو دے دیا تو آپ کی خوشی۔ میں آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتی ہوں، میں اس حالت میں بھی اتنی ہی خوش ہوں جتنی کہ پہلے تھی۔"

میرے اس کہنے پر بھی ان کے چہرے پر افسردگی کے آثار موجود پائے بلکہ اب ان میں شرمندگی کی جھلک بھی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ میں کون سی بات ایسی

کہوں یا کروں جس سے ان کے چہرے پر رنج کی جگہ خوشی کی لہر دوڑنے لگے ۔ انھوں نے جو معافی کی لفظ استعمال کی تھی اس نے مجھے ایک ایسی بات یاد دلادی جس کی ہر مرد کو اپنی بیوی کی طرف سے فکر ہوتی ہے اور جن کے متعلق میں پہلے ہی دن سے دل میں ٹھانے بیٹھی تھی کہ میں ان سے ضرور کہوں گی۔ آج تک کہنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ آج اُن کو اس طرح اپنی گود میں سر رکھے دیکھ کر وہ بات یاد آگئی

میں نے ان کے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "میں نے سچے دل سے اپنا پھر آپ کو معاف کیا!"

وہ اس طرح اُچھل پڑے جیسے میری بات ان کے دل پر گھونسا بن کر لگی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولے۔ "ذکو" مولانا جو تمھیں کہتے ہیں اس کا مجھے بھی آج یقین آگیا۔ تم واقعی جنتی حور ہو!" اور وہ میری گود میں مُنہ چھپاکر سسکنے لگے۔

رحیمن کہتی ہے تم نے اپنے میاں پر جادو کردیا ہے اور چھمی جان نے تم پر ــــ پہلے الزام کی وجہ وہ یہ بتاتی ہے کہ دیوالی کے دن والی گفتگو کے بعد ہی چھمی جان نکال دی گئیں۔ باہر کا بیٹھنا، آدھی آدھی رات تک گھومنا ترک کردیا گیا۔ اب جب بھی سرکاری کاموں سے فرصت ملتی ہے وہ میرے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مجھے اس اس طرح گھورتے ہیں کہ مجھے ہنسی آجاتی ہے، کبھی میں شرم سے پسینے پسینے ہوجاتی ہوں۔ سچ سچ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے آنکھوں کے ذریعہ کھاجانا چاہتے ہیں، سینے میں رکھ لینا چاہتے ہیں، خود کہتے ہیں اندھا تھا۔ اب آنکھیں کھلی ہیں۔ تمھیں نے ان نینوں میں نور ڈالا ہے، تمھیں سے آنکھیں لڑاتا ہوں، تمھارے ہی حسن سے آنکھیں سینکتا ہوں۔ تمھیں کو دیکھ کر آنکھوں میں روشنی بڑھتی ہے، جی ہی نہیں بھرتا!......... نہ جانے اور کیا کیا کہتے ہیں۔ مجھ کو ان کی چلتی ہوئی زبان روکنے کے لئے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دینا پڑتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ سب کو ایسا ہی چاہنے والا میاں دے۔

دوسرے الزام کی وجہ رحیمن یہ بتاتی ہے کہ چھمی جان کے جانے کے ساتویں دن

میرے ہاں اسقاط ہوا اور اس وقت سے جو طبیعت بگڑی ہے، تو سنبھلنے ہی کو نہیں آتی۔ گاؤں کی چمارن نے خوب خوب پیٹ ملا، شہر سے دائی بھی آئی اور ہفتوں رہ کر اور اپنی ساری ترکیبیں کر کے ہار کر چلی گئی۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب ہی آگئے مگر نہ کھانسی جاتی ہے، نہ حرارت۔ کل ڈاکٹرنی آئی تھی۔ کہتی تھی تم کو نسوانی خرابی سے دق ہو گئی ہے۔ بھوالی جانا پڑے گا۔ میں نے کہہ دیا، میں نہ جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے موت مقررہ وقت پر آئے گی۔ نہ ایک لمحہ بعد نہ ایک لمحہ پہلے۔ پھر میں اس کے قدم کیوں چھوڑوں جس کی وجہ سے زندگی جنت ہے! مرنے کے بعد وہ ملنے کی نہیں۔ میری جیسی گنہ گاروں کا وہاں کیا گذر۔ پھر آدھی چھوڑ کر ساری کے پیچھے کیوں دوڑوں؟

ہاں، ایک سوہان روح ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ موئی بیماری ایک سے دوسرے کو ہو جاتی ہے۔ میں لاکھ چاہتی ہوں وہ مجھ سے الگ رہیں۔ اپنے کھانے کے برتن، گلاس، کٹورا، چائے کی پیالی، بستر، تولیہ ہر چیز الگ کر لی ہے۔ رحیمن پر تاکید رکھتی ہوں کہ میری استعمال کی ہوئی چیزیں اُن کے پاس نہ پہنچنے پائیں لیکن وہ ہیں کہ ہر وقت لئے ہی رہتے ہیں۔ میری ہر چیز اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مجھے کوئی بیماری ہی نہیں۔ اندر آئیں گے تو جھٹ میرے پلنگ پر بیٹھ جائیں گے۔ رات کو سوئیں گے تو مجھے گودی میں لے کر سوئیں گے۔ کھانستے کھانستے اُٹھ جاؤں گی تو برابر بیٹھ سہلائیں گے، تولیہ سے مُنہ پونچھتے رہیں گے، اور کھانسی رُکی تو مُنہ چوم لیں گے!۔

بس خدا سے ہر وقت دعا ہے کہ وہ ہر طرح کی بیماری آزاری سے محفوظ رہیں۔ اے میرے اللہ! اپنی گنہگار بندی کی اتنی سی بات سُن لے!

مولانا کے آنسوؤں نے اُن کا پڑھنا بند کر دیا۔ اور اب پڑھنا ہی کیا تھا۔ مصنف نے کتاب کی آخری سطریں لکھ دی تھیں۔ اور آج انھوں نے مر کر تمت بالخیر کا فقرہ بھی بڑھا دیا تھا!......... ساحل پر کھیلنے والے دونوں پیراک آج دریا پار کر چکے تھے۔ زندگی کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے سرچشمے میں جا کر مل گئے تھے اور ذکو کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کیوں قبول نہ ہوئی۔ اس کا

مولانا کے پاس کوئی جواب نہ تھا ـــ اور مولانا کو ایسا محسوس ہوا جیسے ذکّو اپنے دل نشین انداز میں ان سے کہہ رہی ہے "ابا جان! ابا جان!' ملاقات کی بھوکی روح اپنے ہمدم کو پاس بلالینے میں کامیاب ہوئی۔ ہم جُدائی کے زخم کو ناسور میں بدلنا نہ چاہتے تھے۔ ہماری جنت ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہنے میں ہے! ...... اور ابا جان جسے میں اچھا سمجھتی تھی اُسے آپ بُرا سمجھنے والے کون؟ اور جسے آپ نے گناہ کرتے نہیں دیکھا، اُس کے گنہگار ہونے کا آپ کو یقین کیسے؟

اور مولانا اجتبٰی کو خیال آیا اظہر کی لاش مسجد کے سامنے اب بھی رکھی ہے اور لوگ منتظر ہیں کہ امام آئے تو نماز پڑھی جائے اور وہ لپکتے، ہانپتے، رستے گھر سے نکلے اور صفوں کے آگے کھڑے ہو کر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر گواہی دی:-

"سب کے بخشنے والے!' ہم اِس میّت کے بارے میں سوائے نیکی اور بھلائی کے کچھ نہیں جانتے!"

کرشن چندر

حُسن اور حیوان

سحر کی اڑتی، گھلتی ہوئی، سیاہی اور سفیدی میں وہ ایک چھوٹے سے نالے کے قریب پہونچ گیا اور اپنے کپڑے اُتار کر ننگ دھڑنگ نالے میں گھس گیا۔ پانی ایک دو جگہ اتنا گہرا تھا کہ کمر تک آتا تھا، پاؤں کہیں کومل، ملائم ریت اور کہیں نیلے نیلے پتھروں پر پھسلتے معلوم ہوتے تھے۔ شوخ و شنگ مچھلیاں اپنے نقرئی دھڑوں کو ہلاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی جاتی تھیں۔ کئی پتھروں پر اودی، سبز یا سیاہ کائی جمی ہوئی تھی اور جب نہاتے نہاتے غیر ارادی طور پر اُس کے پاؤں اُن پتھروں سے جا لگتے تو اس کے بدن کے روئیں روئیں میں ایک خاص قسم کی جنسی لذت کا احساس جاگ اٹھتا اور وہ مسرور ہو کر منہ میں پانی بھر کر زور زور سے غلو غلو غلو کرتا اور کلیوں۔ سے چھوٹے چھوٹے فوارے چھوڑتا، ہنستا، گاتا، پانی میں ناچتا اور دونوں ہاتھوں سے چھینٹے اڑاتا، جیسے اس کے سامنے اس کا گہرا دوست یا محبوب کھڑا ہو۔

لیکن نالے میں اس وقت اُس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ صرف ایک چٹان کے کنارے ایک سُرخ رنگ کا کیکڑا اپنی چھوٹی آنکھوں سے اس کی دل چسپ حرکات دیکھ رہا تھا اور اس کی بوالعجبی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ نالے کے تینوں طرف اونچی اونچی گھاٹیاں تھیں۔ چوتھی طرف یہ نالہ، دریائے ں مل جاتا تھا۔ جہلم کے پار مری کے سلسلہ ہائے کوہ پھیلے ہوئے تھے اور ان کے سینے کو چیرتی ہوئی موٹر کی سڑک ایک بڑے اژدہے کی سفید کینچلی کی طرح بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ خاموشی مکمل سناٹا۔ نہ موٹر کی گھوں گھوں نہ چیڑھ کے درختوں کی سائیں سائیں۔ نہ گٹاریوں کی کرائیں کرائیں۔ نالے کا پانی تک سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور کہیں کہیں چٹانوں کے قریب پانی کے گزرنے سے ترل رل، ترل رل کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ لیکن یہ آواز بھی اتنی مدھم ...... تھی کہ سناٹے سے ہم آہنگ معلوم ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے پانی میں غوطہ لگاتا اور پانی میں غوطہ لگاتے ہی آنکھیں کھول

دیتا اور چند لمحوں کے لئے اس زیرِ آب جہانِ رنگ و بو کا تماشا دیکھتا۔ پھر جب اس کا سانس گھٹنے لگتا تو وہ اپنا سر پانی کی سطح کے اوپر اٹھا لیتا اور اُس ترل رِل ترل رِل کی مدھم میٹھی صدا کو سنتا جو یا تو کائنات کی خاموشی کی بازگشت تھی یا اُس کے تیز تیز سانس کی لَے یا صبح کے لطیف لبوں کا لمس۔

نہاتے نہاتے جب اُسے بدن کے ہر مسام میں برف کی سوئیاں چُبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور جب نالے کے منبع پر اڑتے ہوئے بادلوں کے کنارے سورج کے ابلتے ہوئے سونے سے دمکنے لگے تو اسے اپنے دن بھر کے سفر کا خیال آیا۔ بیس میل کا لمبا سفر اور اسے کل صبح ڈھلیر کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے کا چارج لینا تھا۔ راستہ نامعلوم تھا اور دشوار گذار بھی، امید تھی کہ راستہ پوچھ پوچھ کر وہ منزل پر جا پہنچے گا۔ کچھ عرصے کے ذہنی پس و پیش کے بعد وہ نالے سے باہر نکلا۔ جھولے سے تولیہ نکال کر بدن پونچھا۔ پھر ناشتہ نکالا اور ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ روٹی کے ریزوں نے جو بار بار پانی میں گرتے تھے۔ مچھلیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ چٹان کے گرد اس طرح جمع ہو گئیں جس طرح مقناطیس کے گرد لوہے چون کے ذرّے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ روٹی، اس نے سوچا، دنیا میں سب سے بڑا مقناطیس ہے اور اب تو وہ سرخ رنگ کا کیکڑا بھی اپنے بیشمار ہاتھ ہلاتا ہوا، پانی میں تیرتا ہوا، اُن ریزوں کی طرف آ رہا تھا۔ بیس میل کا سفر تھا لیکن اس سفر کے آخر میں بھی ایک روٹی کا ٹکڑا ہی تھا جس کی طرف وہ کھنچا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ یہ بیس میل بنسی کے ایک لمبے تار کی طرح تھے۔ جس کے سرے پر ایک ہک میں روٹی کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ ناشتہ کھاتے کھاتے اُس نے اپنے آپ کو اُس بے بس مچھلی کی طرح جانا جس کے گلے میں بنسی کا کانٹا اٹک گیا ہو۔ اور وہ کھانسنے لگا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر وہ مسکرانے لگا اپنے تخیل کی زقند پر، نالے کے منبع پر بادلوں کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ اور ان کے پیچھے ایک سنہری سیال ابلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ اُبلتا ہوا سیّال بادلوں کو پھاڑ کر باہر نکلے گا اور دن چڑھ جائے گا۔ اُسے اب چلنا چاہیئے۔

جب وہ چلا تو کیکڑے نے ایک مچھلی کو پکڑ لیا اور اب وہ اپنی چینی آنکھوں سے اپنے شکار کی طرف پُرمسرت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پہلے پانچ میل کی سُکوڑ چڑھائی تھی۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی اوپر ہی اوپر چڑھتی

جا رہی تھی۔ جیسے آسمان کو چھو کر ہی دم لے گی۔ بیوقوف پگڈنڈی، بھلا آسمان کو کون چھو سکتا ہے۔ اُسے پگڈنڈی کی اس نامعقول حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اگر وہ آرام سے مزے میں چلتی جاتی تو نہ مسافروں کو تھکن محسوس ہوتی نہ ان کے سانس کی دھونکنی تیز ہوتی۔ نہ ان کا جسم پسینے میں شرابور ہوتا ——— لیکن اب یہ سب کچھ تھا اور پگڈنڈی تھی کہ برابر اونچی ہوتی جا رہی تھی جیسے وہ آسمان کو چھو لے گی۔ پگڈنڈی کی یہ خواہش اک آرزوئے ناتمام کی سی تھی۔ کیونکہ درحقیقت آسمان کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت سراب کی سی ہے جو چیز نہ ہو اسے کیونکر کوئی پا سکتا ہے۔ لیکن پگڈنڈی ..... بہر حال مجھے سستا لینا چاہیے۔ اس نے سوچا مجھے اسی پگڈنڈی پر بیس میل چلنا ہے۔ اس پگڈنڈی کے گناہ پگڈنڈی کے مسافروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ انجیل میں صاف لکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس پھگواڑے کے درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیا جائے۔

وہ پہاڑی انجیر کے درخت کے تنے سے سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس درخت کے سامنے انجیر کا ایک اور درخت تھا۔ نیچے ایک تلہٹی تھی جہاں دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں مکئی کے پودے اگے ہوئے تھے۔ اُن کے پرے بنج کی باڑھ تھی اور اُس سے پرے وہی نیلا آسمان اور اس میں مری کے سلسلہ ہائے کوہ اور اُن کے سینے کو چیرتی ہوئی موٹر کی سڑک۔ اُس نے اس منظر کی طرف دیکھتے دیکھتے یہ معلوم کر لیا کہ یہ سارا منظر نقلی تھا۔ آسمان کی نیلی سطح پر کسی نامعلوم مصور نے یہ چند آڑے ترچھے نقوش کھینچ دئے تھے۔ ان میں جان بالکل نہ تھی۔ نہ رعنائی نہ خوبصورتی۔ پھر کہیں سے ایک لاری چیونٹی کی طرح رینگتی ہوئی موٹر کی سڑک پر چلتی ہوئی نظر آئی۔ آسمان پر چیل اپنے پر تولتی ہوئی نظر آئی۔ بنج کی باڑھ سے ایک مرد اور عورت باہر نکلتے نظر آئے اور مکئی کے پودوں میں گھس گئے۔ سامنے انجیر کے درخت پر دو چڑیاں نظر آئیں۔ اور پھدک پھدک کر ایک دوسرے سے چونچ ملانے لگیں۔ اب ہر طرف حرکت تھی اضطراب ——— جامد تصویر لرزشوں کا مرقع بن گئی تھی۔ خاموشی میں ترنم پیدا ہو گیا تھا۔ آسمان کی نیلی سطح میں سمندر کی سی گہرائی۔ اس نے سوچا مادے سے حرکت اور حرکت سے تخیل پیدا ہوتا ہے۔ اس پگڈنڈی کے تخیل کی طرف دیکھو۔ اس کی ہمت، اس کی جرأت، اس کی سعی جمیل کی داد نہ دینا ایک ظلم ہوگا۔ اور ایک میں ہوں کہ آدھ گھنٹے سے یہیں سستانے بیٹھا ہوں۔ اور ابھی تک وہ مرد اور عورت کھیتوں سے باہر کیوں نہیں نکلے۔ شاید کھیتوں کی نلائی کر رہے

ہیں۔ چڑیوں نے ہنس ہنس کر کہا۔ چوں چوں چوں۔ یعنی ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔ جاؤ اپنی راہ لو اور ہماری خوشیوں میں خلل نہ ڈالو۔ وہ گھٹنوں کا سہارا لے کر اٹھا اور آگے چل پڑا۔

پگڈنڈی کا رنگ زرد تھا۔ کناروں پر سبز گھاس سرنگوں تھی۔ کہیں کہیں جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن مُرجھائے سے جیسے سفر کی تکان سے چور ہو گئے ہوں۔ جیسے انھیں پیاس لگی ہو اور انھیں پانی دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ آگے بڑھتا گیا اور اس کی پیاس چمک اٹھی۔ پگڈنڈی اب ایک اونچے کھیت کی مینڈ کے نیچے گذر رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نازک اندام بکری کھیت کی مینڈ پر چرتی نظر آئی۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بکری نے سر اُٹھا کر اک نگاہ غلط انداز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر "اوں ہوں ہیں ہیں" کر کے منہ پھیر لیا۔ جیسے کہہ رہی ہو" میاں آگے بڑھو، یہاں کوئی پانی وانی نہیں، میرے تھنوں میں جو دودھ ہے وہ میرے مالک کے لئے وقف ہے۔"

اس نے ٹوپی اٹھا کر کہا" بہت اچھا مادام۔ تمہارا جسم تمہارے خاوند کے لئے ہے۔ تمہارا دودھ تمہارے مالک کے لئے، تمہاری روح ہندوستانی عورت کی ہے، اس ملک میں پیاسے مسافروں کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں۔ سفر کو اسی لئے یہاں ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ مسرت نہیں اور کالے پانی پار جانا تو ایک گناہ ہے۔ بہت اچھا مادام، یونہی سہی معافی چاہتا ہوں۔

پیاس سے حلق میں کانٹے سے چُبھنے لگے اور یہ پگڈنڈی ابھی اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ راستے میں اسے ایک کسان ملا اس نے پوچھا۔

"بھئی یہاں کوئی پانی کا چشمہ ہے؟"

"ہے تو سہی لیکن یہاں سے کوئی تین میل اوپر چڑھ کر۔"

"بہت پیاس لگی ہے بھائی، نزدیک کوئی چشمہ ہو تو بتا دو۔ بڑا احسان ہوگا۔"

کسان زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی لاٹھی سے بندھی گٹھڑی کو کھولا۔ اور اس میں سے ایک زعفرانی رنگ کی موٹی سی ترینڑی نکالی۔ خوب رس دار تھی اور تازہ۔ اُس نے اُسے پتھر پر توڑ کر دو ٹکڑے کر دیئے۔ آدھی ترینڑی اُسے دیکھ کر کہا" پہلے تو اس کا رس پی جاؤ، بیجوں سمیت، پھر راستے میں اس کی پھانکیں کھاتے جانا، اللہ نے چاہا تو تین میل تک اب پیاس نہ لگے گی۔

کھٹا سا لذیذ رس جیسے گول گئے۔ بیچنے والوں کے اں ہوتا ہے۔ بیجوں سمیت اُس کے

حلق میں اترتا چلا گیا اور اس کی آنکھوں کی چمک پھر عود کر آئی۔ تریڑی کا ایک قتلہ اتار کر کھاتے ہوئے اس نے کسان کا شکریہ ادا کیا۔ کسان نے اس سے برادرانہ انداز میں پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"موضع دھریلہ۔"

"ٹھیک یہی راستہ ہے۔"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں کوہالے جا رہا ہوں۔ سنا ہے وہاں موٹر سڑک پر بوجھ اٹھانے والوں کی ضرورت ہے۔ اب کے فصل کچھ اچھی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔"

لگان، رشوت، نمبردار، بچے، بیوی، کسان گٹھڑی کاندھے پر رکھ کر پگڈنڈی سے نیچے کی طرف اترتا گیا۔ یہ مقناطیس کی دوسری سمت تھی۔ یا وہی بنسی کا کانٹا، جو نجات پانے تک زندگی کے حلق میں اٹکا رہتا ہے۔ پیاس بجھ چکی تھی اور وہ تریڑی کے قتلے کھا رہا تھا۔

ایک سریں کے درخت کے نیچے ایک بوڑھا کسان اور ایک ننھی سی لڑکی نظر آئے ——

کسان ہنس کر مرغ کی بولی بول رہا تھا۔ "ککڑوں کوں —— ککڑوں کوں ——"

ننھی لڑکی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "ابا جی ایک دفعہ پھر۔"

"ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔"

مسافر کو تریڑی کھاتے دیکھ کر وہ مچل اٹھی۔ "ابا جی! میں بھی تریڑی کھاؤں گی۔ میں بھی تریڑی کھاؤں گی۔"

مسافر مڑا اور سریں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔

"سلام راہی۔" بوڑھے کسان نے کہا۔

"سلام بابا۔"

"میں تریڑی کھاؤں گی ابا جی۔"

مسافر نے تریڑی کا ایک قتلہ لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکی کے گلاب سے رخسار شہابی ہو گئے۔ اس نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ وہ بڑے مزے سے اس کی گود میں بیٹھ کر تریڑی کھانے لگی۔

"کتنی پیاری لڑکی ہے۔ یہ تمھاری لڑکی ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"جری (یعنی ننھی)۔ جی یہ میرے بیٹے کی لڑکی ہے۔ لیکن مجھے ابا کہہ کر پکارتی ہے۔ کیونکہ میرا بیٹا لام پر گیا ہوا ہے۔ یہ اُس وقت تین چار مہینے کی تھی۔"

لام۔ جنگ، یہ خوبصورت گول چہرہ، گلابی رخسار، چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں۔ مشین گنوں کی تڑاتڑ، چیختے ہوئے بم اور تاروں پر الجھی ہوئی آنتیں۔ اس نے سوچا بعض پیاسیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں بجھانے کے لئے انسان انسانوں کے قتلے کر ڈالتے ہیں بالکل اسی تربیٹری کی طرح۔ لیکن ترببٹری تو ایک جامد چیز ہے اور انسان ایک متحرک، اضطراری شعلہ مادّے سے حرکت اور حرکت سے تخیل پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس انسان کا تخیل دیکھو اور پھر اس پگڈنڈی کا تخیل ...... مقناطیس کی دو مخالف سمتیں۔

بوڑھے نے چلا کر کہا۔ "ککڑوں کوں"۔

تین میل اوپر چڑھ کر وہ ایک چشمے کے کنارے پہونچ گیا۔ درختوں کے جھنڈ میں بہت سے راہی بیٹھے ہوئے تھے۔ چشمے کے کنارے لکڑی کا نل لگا ہوا تھا۔ جس میں پانی ایک موٹی دھار کے نیچے رکھ دی اور پانی پینے لگا۔ پانی اُس کے حلق کے نیچے اُتر رہا تھا۔ پاؤں دھوکر اور تازہ دم ہوکر وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ یہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی ایک کھانا تیار کر رہے تھے۔ کچھ لوگ بنئے کی دوکان سے آٹا اور گڑ لے رہے تھے۔ جو درختوں کے جھنڈ کے قریب ہی تھی۔ ایک گھاس کے قطع پر چند ایک خچریں چر رہی تھیں اور اُن کا مالک انھیں دانے کے لئے قریب بلا رہا تھا۔ ایک راہی مکئی کی روٹی گڑ کے ساتھ کھا رہا تھا اور تین لقموں کے بعد پانی کے دو گھونٹ پی لیتا تھا۔ مکئی کی روٹی تقریباً ہر ایک کے پاس تھی۔ کسی کے پاس پسا ہوا نمک مرچ تھا تو کسی کے پاس پیاز۔ ہاں، سالن کسی کے پاس نہ تھا۔ نہ اچار، نہ مربّے، نہ مکھن۔ یہ لوگ خچروں کی طرح نہایت انہماک سے اپنے جبڑے ہلانے میں مشغول تھے۔

مکئی کی روٹی، اسے معلوم تھا۔ اس قدر خشک ہوتی ہے، کہ دہن کا لعاب اُسے تر کرکے حلق کے نیچے گزارنے کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اِسی لئے تو بار بار پانی پیا جاتا ہے۔ جب سالن موجود نہ ہو تو پانی ہی بہترین سالن ہوتا ہے۔ ایک ہزار سال کی معاشی و تمدنی ترقی کے بعد بھی انسانی تہذیب اس سے کچھ زیادہ نہ کرسکی تھی کہ انسانوں کی بیشتر آبادی کو خشک روٹی اور پانی مہیا کرسکے۔ خشک روٹی اور پانی اور خچروں کی طرح چلتے ہوئے جبڑے اور بے نور آنکھیں۔

اُس نے چپڑی ہوئی لچکیلی گیہوں کی روٹی پر مربہ لگاتے ہوئے سوچا کہ وہ آج اس درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے کسانوں کو مکھن، اچار اور مربہ بانٹ کر ہزاروں سالوں کی روایت کو توڑ دے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ اُسے ابھی پندرہ میل اور سفر کرنا ہے اور بہر حال ہزاروں سالوں کی بھوک مربے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے نہیں مٹائی جا سکتی۔

جب وہ اپنا تھیلا بند کر کے چلنے کو تھا اس کی نگاہ انسانوں کی ایک ٹولی کی طرف گئی۔ جو اوپر پگڈنڈی سے چشمے کی طرف آ رہی تھی۔ دو انسان جن کے سروں پر سُرخ و زرد پگڑیاں تھیں اور جنھوں نے خاکی رنگ کے لباس پہن رکھے تھے اور جن کے شانوں پر پیتل کے چمکتے ہوئے بلّے لگے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان کسان کو اپنے درمیان پکڑے ہوئے لا رہے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس نوجوان کے ہاتھ اس کی پشت پر ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی آ رہا تھا اور وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لئے چلا آ رہا تھا اور اُس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی کی نگاہیں نیچی تھیں اور قدم ناہموار۔ جب وہ درختوں کے جُھنڈ کے قریب پہنچے تو سارے کسان راہی ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بنیا بھی اپنی دکان سے باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر ان کے لئے دو چارپائیاں دکان سے نکال لایا اور ان پر اُجلی چادریں بچھا کر ان سے بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔ ان کی شان بے نیازی اور ان کا انداز تفاخر کہے دیتا تھا کہ یہ نئے لوگ کسی پُر اسرار قوت کے مالک ہیں جو ان دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں۔ ایک آدمی جو اِن سب کا سردار معلوم ہوتا تھا اُس نے لڑکی کو پرے ایک درخت کے نیچے بیٹھنے کو کہا اور پھر وہ اُن دو آدمیوں سے مخاطب ہوا جو اُس نوجوان کسان کو پکڑے ہوئے تھے:

"او دتے! شاہباز! اس حرامی کی ہتھکڑی ذرا ڈھیلی کر دو۔ اور اُسے پانی وغیرہ پلاؤ۔"

بنیا بولا۔ "حضور جل لاؤں۔ ٹھنڈا میٹھا شربت۔ کوہالے سے نئی مصری منگوائی ہے۔"

دِلا اور شاہباز کسان کو ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے چشمے کی طرف لے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے ہی ایک خچر والا اپنے خچر کو پانی پلا رہا تھا۔

حضور نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں شاہ جی شربت پلائیے بہت پیاس لگی ہے اور کھانا ہم یہیں کھائیں گے۔ کوئی مرغی وغیرہ ہے"۔

"جی حضور، ابھی سب انتظام ہوا چاہتا ہے"۔ بنیئے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بتیسی نکالتے ہوئے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔

خچروں والا خچر کو پانی پلا کر اس پر سامان لادنے لگا۔ دُلا اور شاہباز نوجوان کسان کو پانی پلا کر واپس لے آئے اور اسے اپنے سردار کے سامنے بٹھا دیا۔

حضور نے کسان سے کہا "کان پکڑو۔ میں کہتا ہوں حرام زادے کان پکڑو"۔

کسان نے اپنی باہیں ٹانگوں کے نیچے سے گزار کر کان پکڑے۔ دُلے نے پتھر کی ایک بھاری سِل اس کی پیٹھ پر رکھ دی، کان پکڑنے والے جانور کے مُنہ سے ہائے نکلی، لڑکی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ حضور شربت پی رہے تھے۔ ایک دو گھونٹ پی کر کہنے لگے۔" شاہباز اس کی پیٹھ پر ایک اور سِل رکھ دو"۔

لڑکی کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ اور اُس نے اپنا منہ سرخ سوسی کے دوپٹے میں چھپالیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسان کی پیٹھ دوہری ہو کر ٹوٹ جائے گی۔ حضور نے پوچھا۔

"بول اب بھی اقبال کرتا ہے یا نہیں! تو اس نابالغ لڑکی کو اغوا کر کے لایا ہے یا نہیں؟"

"نہیں!" کسان نے رک رک کر کہا "یہ نابالغ نہیں اپنی مرضی سے آئی ہے"۔

"مجنوں کے سالے۔ اب بھی برابر انکار کیئے جاتا ہے۔ شاہباز اس کی کمر پر ایک اور پتھر رکھ دو"۔

خچر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ راہیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ یہ سب لوگ کسی پراسرار قوت کے زیر اثر معلوم ہوتے تھے۔ لڑکی نے چیخ کر کہا "اسے چھوڑ دو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں، اسے چھوڑ دو۔ یہ مر جائے گا۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے ہی اسے ترغیب دی تھی اور یہ مجھے بھگا کر لایا ہے، در اصل میں اس کے ساتھ بھاگ کر آئی ہوں۔ یعنی میں ہی اسے بھگا کر لائی ہوں"۔

حضور نے مسکراتے ہوئے کہا "دیکھو، دیکھو۔ کیسی وکیلوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ تیری سب شوخی نکال دوں گا ذرا ٹھہر تو پہلے مجھے اس سے نبٹ لینے دے۔ کیوں بے اُلّو کے پٹھے"۔

اُلّو کے پٹھے نے ہانپتے ہوئے کہا "میں نے کوئی اغوا نہیں کیا"۔

"اسے اسی طرح رہنے دو" حضور نے فیصلہ سنایا۔ جب تک ہم کھانا وغیرہ کھائیں گے"۔

یہ کہہ کر انھوں نے منہ پھیر لیا اور بنئے سے باتیں کرنے لگے۔" میں موضع دھیر کوٹ سے آرہا ہوں۔ یہ کسان اس خوبصورت لڑکی کا اغوا کر لایا ہے۔ چار دن سے مارا مارا اس کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ آج یہ دونوں عاشق و معشوق ہاتھ لگے۔ کوہالے سے پار جانے کی کوشش میں تھے۔ لیکن میں انھیں کب چھوڑنے والا تھا۔ میں اُس راستے کو سونگھ لیتا ہوں۔ جہاں سے مجرم ایک بار گذر جائے۔ اب یہ بدمعاش اقبال نہیں کرتا۔ ایک تو جُرم کیا ہے۔ اُس پر یہ سینہ زوری۔"

بنیا ہاتھ جوڑ کر بولا۔" حضور، ہم تو حضور کے جان و مال کو دعائیں دیتے ہیں۔ آپ کی برکت سے علاقے میں بالکل امن ہے۔ چوری چکاری ڈکیتی کا قریباً قریباً خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہ کسان لوگ بہت بے باک اور بے شرم ہوتے ہیں۔ اب اس کی طرف دیکھیے۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تاکنا کہاں کی شرافت ہے اور پھر انہیں اغوا کر کے لے جانا۔ رام رام۔ حضور ایسے مجرموں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔"

حضور نے اس نوجوان لڑکی کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔" قانون یہی کہتا ہے شاہ جی، ہم تو قانون کے بندے ہیں، اگر کوئی اغوا کرے گا۔ یا کسی کی بہو بیٹی پر ہات ڈالے گا تو ہم ضرور اُسے مجرم قرار دیں گے۔ اور اُسے سزا دیں گے۔ وہ مُرغ آپ نے ابھی حلال کروایا کہ نہیں۔ شاہ باز جا شاہ جی سے مرغ لے کر حلال کر!"

نوجوان کسان کا چہرہ زمین سے لگتا جا رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینہ بہ رہا تھا۔ سب مسافر وہاں سے چل دیئے تھے۔ لیکن اس سے نہ جانے کیوں وہاں سے ہلا نہ جاتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ کوئی پُراسرار طاقت تھی۔ جس نے اس نوجوان کسان کو یوں اذیت اٹھانے پر مجبور کر دیا اور یہ بنیا اس کسان کی تکلیف پر اس قدر مسرور تھا۔ یہ لڑکی کیوں اس قدر گھبرائی ہوئی نگاہ سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یکایک دو گلہریاں ایک جھاڑی سے ایک ساتھ اڑیں اور خوشی سے چیخیں مارتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئیں۔ یہ گلہریاں اس نے سوچا ایک دوسرے کو اغوا کر لے جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں، ایک دوسرے سے محبّت کرتی ہیں۔ لیکن اُن کی پشت پر کیوں کوئی پتھر نہیں رکھتا۔ اور یہاں کیوں ہر اس انسان کے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جاتی ہے۔ جس کے سینے میں اپنے ہم نفس کے لئے محبت کی آگ روشن ہو اُٹھے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔

شاہبانے مرغ پکڑ لیا۔ مُرغ چلاّ رہا تھا۔ کُڑ کُڑ کُڑ۔ کُڑیں کُڑیں ـــــ اور اُسے وہ بوڑھا کسان یاد آگیا جو اپنی پونی کو مُرغ کی بولی سُنا کر خوش کر رہا تھا اور جس کا بیٹا لام پر گیا ہوا تھا۔ نوجوان کسان کے صبر کا بند اب ٹوٹنے کو تھا۔ اُس کا گلا رُندھ گیا اور وہ کراہ رہا تھا۔ میرے اللہ۔ میرے اللہ۔

میرے اللہ! لیکن کائنات کی غیبی قوت خاموش تھی۔ کسان کی یہ معصوم اُمید کہ یہ غیبی قوت اُسے بچائے گی۔ پگڈنڈی کی آرزوئے خام کی سی تھی۔ کیونکہ درحقیقت آسمان کہیں نہیں ہے۔ اس کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ جو چیز نہ ہو اُس سے کیونکر کسی کو مدد پہنچ سکتی ہے۔

لڑکی ایک بار جوش میں آکر اُٹھی اور اُس نے پتھر کی سلیں اپنے ہاتھوں سے پرے دے ماریں۔ کسان پسینے میں تر بتر اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی اُس کے گلے سے چمٹ گئی۔ رو رو کر کہنے لگی "اقبال کر لو۔ خدا کے لئے اقبال کر لو۔ میں مر جاؤں گی۔ تم بھی مر جاؤ گے"۔ پھر وہ مفرور سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "آپ اسے کچھ نہ کہئے۔ میں اقبال کرتی ہوں کہ یہ زبردستی اغوا کر کے لایا ہے، زبردستی، میں اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کے پاس واپس جانے کو تیار ہوں۔ آپ اب اسے کچھ نہ کہیئے۔ میں ہر ایک آدمی کے سامنے یہ بیان دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے اسے چھوڑ دیجئے"۔

سہ پہر گذرتی جا رہی تھی۔ پہاڑوں کے سائے نچلی وادیوں کو اپنی تاریکیوں کے پیٹ میں لے رہے تھے۔ اب وہ بہت مضمحل تھا۔ تھکن سے ٹخنوں تلووں اور گھٹنوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا تھا جیسے اُس کی ٹانگیں لکڑی کی ٹانگیں ہوں۔ اور ہر ایک جوڑا الگ ہو۔ بہت دیر تک راستے پر وہ اکیلا چلتا رہا۔ اس کے خیالات یاس انگیز اور اُس کا تخیل جنونی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انسان ابھی انسان نہیں ہے۔ جنگ جو آزادی، تہذیب اور انصاف کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ غالباً آخری جنگ نہ ہوگی۔ آخری جنگ شاید اس ظالم جذبے کے خلاف ہوگی جو انسانی محبت کے سرچشمے پر سِل رکھ کر زندگی کے اس منبع کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن یہ جنگ کب لڑی جائے گی؟ کب کب؟ شاید تب تک وہ زندہ نہیں رہے گا۔ غالباً وہ زندہ نہ ہوگا۔ اپنی زندگی میں وہ انتقام کے اس بے پناہ جذبے سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکے گا۔

جس کی تشنگی سے اُس کی روح کا ذرّہ ذرّہ کانپ رہا تھا۔ غصّے اور رنج سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس کے قدم بھاری ہو گئے۔ راستے میں اُسے مزدوروں کے کئی قافلے ملے جو نمک کے ڈلے اُٹھائے اپنے گھروں کو لے جا رہے تھے۔ پہاڑی دیہاتوں میں نمک اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ یہ لوگ بنئے سے خرید کر استعمال کرنے کی توفیق نہیں رکھتے ــــ توفیق؟ توفیق؟ آخر وہ کس چیز کی توفیق رکھتے ہیں؟ یہ تو محبت کی بھی توفیق نہیں رکھتے ...... اُس نے سوچا اُسے ایسی تلخ باتیں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ نوجوان ہے خوشحال اور غیر شادی شدہ۔ مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر، زندگی کی ساری مسرتیں اُسے مہیا ہیں۔ کل صبح اُسے اپنی نوکری پر حاضر ہو جانا ہے۔ لڑکوں کو پڑھانا ہے۔ سچ بولو۔ ماں باپ کی عزت کرو۔ حاکم کا حکم مانو۔ بڑے ہو کر اغوا نہ کرو۔ یہ بنئے کی دُکان ہے۔ مرغ بولتا ہے ککڑوں کوں .....

ایک خچّر والا اپنا خچّر لئے جا رہا تھا۔ خچّر پر تھڑا پلان کسا ہوا تھا۔ لیکن اسباب نہیں لدا ہوا تھا۔ غالباً کسی جگہ سامان پہنچا کر واپس لوٹ رہا تھا، اُس نے خچّر والے سے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"کھرن درّے تک۔"

"کیا یہ درّہ موضع دھلیر کے راستے پر ہے۔"

"ہاں اُس سے پانچ میل دور ہے۔"

"مجھے اِس خچّر پر چڑھا کرلے چلو! کیا لوگے؟"

"جو جی میں آئے دے دینا۔ میں تو خچّر واپس لئے جا رہا ہوں۔"

"آٹھ آنے۔"

خچّر والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور وہ کود کر خچّر پر سوار ہو گیا۔ خچّر نے بدن کسمسایا۔ کان ہلائے۔ نتھنے پھٹپھٹائے، اور دیکھا کہ اب کوئی چارہ نہیں تو چل پڑا۔ خچّر والا دل دوز آواز میں گانے لگا۔ ع

کسی کی کھاک میں ملتی جوانی دیکھتے جانا

وہ کھرن کے درّے پر خچّر والے سے رخصت ہوا اور اس سے راستہ پوچھ کر آگے بڑھا

چلتے چلتے وہ راستہ بھول گیا۔ یا شاید اس نے سمجھا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے اور کسی عجیب دُنیا میں آنکلا ہے۔ یہاں پگڈنڈی ایک ٹلے پر منتج ہوجاتی تھی۔ اس جگہ جنگلی گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے اور دو نوجوان لڑکیاں کاندھوں پر سوٹیاں رکھے ہوئے ایک سبز پوش چٹان پر بیٹھی ہوئی لاجو گا رہی تھیں۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا۔
بھلا کیہڑے کمے لایا وے لاجوا۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا۔
چن مہاڑا چڑھیا بھلا بٹیاں دے اوہلے

اُسے دیکھ کر پہلے تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر شرما گئیں اور اُنہوں نے گانا بند کر دیا۔ مسافر ایک لمبا سانس لے کر اُن کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا "اور گاؤ۔ مجھے لاجو بہت پسند ہے۔" یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

"چن مہاڑا چڑھیا۔ بھلا بٹیاں دے اوہلے دے لاجو!"

"کیکر ملساں، بھلا جندریاں دے اوہلے دے لاجوا"

"لاجو آیا۔ لاجو آیا"
لڑکیوں نے حیران ہو کر کہا "تمہیں 'لاجو' آتا ہے؟"
"ہاں۔ بلکہ میرا تو نام ہی لاجو ہے۔" اُس نے ہنس کر جھوٹ موٹ کہا۔ "اور تمہارا نام کیا ہے؟"
ایک نے کہا "بانو"
دوسری بولی "بیری"
اُس نے کہا "اب تو لاجو گاؤ"
بانو اور بیری چند لمحے تک ایک دوسرے سے سرگوشی کرتی رہیں۔ اُن کے انداز کہے دیتے تھے کہ وہ کسی شرارت پر آمادہ ہیں۔ پھر اُنہوں نے شوخ سُروں میں گانا شروع کیا اور وہ اپنے

اپنے ہاتھوں سے تال دینے لگا۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا۔
بھلا کیہڑے کے لایا دے لاجوا۔

لاجو آیا۔ لاجو آیا۔
بھلا جوڑے گنڈھن لایا دے لاجوا

گاتے گاتے وہ کھِل کھلا کر ہنسنے لگیں۔ اور مسافر بھی اُن کی سادہ ظرافت سے بہت محظوظ ہوا اور اُن کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "اگر لاجو کو بانو اور بیری کے جوتے گانٹھنے کے لئے کہا جائے تو اُسے کبھی انکار نہ ہوگا۔ اس تعریفی جملے کے بعد اُس نے بانو اور بیری کے رُخساروں پر وہ جنگلی گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے جو اُس کے قریب بیلوں میں آویزاں تھے۔

وہ کچھ عرصے تک اُن کے گیت سُنتا رہا اور اُن کے گیتوں میں شریک ہوتا رہا۔ پھر جب سورج غربی سلسلہ ہائے کوہ پر جُھک گیا تو اُس نے چلنے کی ٹھانی۔

بانو نے دھیمے لہجے میں کہا۔" اچھا! آج یہیں رہ جاؤ۔ ہم تمہیں اپنے گھر میں جگہ دیں گے۔ تمہیں سونے کے لئے ایک کھاٹ چاہیئے اور ایک کمبل ٹھیک ہے نا!"

بانو کی آواز میں ایک ہلکی لرزش تھی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر لال ہو گیا۔ بیری نے شوخ نگاہوں سے مسافر کی طرف دیکھا۔

اور مسافر نے ان پہاڑی مہ جبینوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ نہیں۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ میں اِن اُلجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مگر مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چھٹپن سے ہی کھیلتا اور محبت کرتا چلا آیا ہوں۔ شاید تمہارے بچپن کا ساتھی ہوں۔ تمہارے لاپروا اور لاُابالی بھائی کا دوست، تمہارے گیتوں کا لاجو۔ میں نے ندی کے نیلے پانی میں تمہارے ساتھ تیرتے ہوئے تمہارے سنہری بالوں کی چوٹی پکڑ کر یوں گھسیٹا ہے کہ تم بے اختیار چلاّ اُٹھی ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیئے میں کئی بار بٹنگ کے درخت کے گرد ناچا ہوں اور آملوک توڑ کر کھائے ہیں۔ نرناری کے پھولوں کا

ہار بنا کر ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کیئے ہیں۔ کئی بار جب چاند اخروٹوں کے جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا ہے۔ میں نے چاندنی اور اندھیارے کی کانپتی ہوئی شطرنج پر تمہارا انتظار کیا ہے۔ تمہاری لچکتی ہوئی کمر میں ہاتھ ڈال کر تمہارے کسمساتے ہوئے بدن کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ میں ان پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح شوخ اور نازک لبوں کا مزہ جانتا ہوں۔ تمہارے مدّھم سانس کی حلاوت اور سیاہ آنکھوں میں چمکتے ہوئے موتیوں کی تابانی سے آگاہ ہوں۔ لیکن میں اِن اُلجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اپنے دل میں اِس شمع کو محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ جو شیشے کی چار دیوار سے باہر پھول کی طرح خوبصورت پروانوں کی طرف تکتی ہے اور جلتی اور جگمگاتی رہ جاتی ہے۔ مسافر نے نگاہ پھیر کر نیچے گاؤں کی طرف دیکھا۔ گھاٹی کے نیم دائرے کے نیچے گاؤں ایک خاموش ندی کے کنارے سویا پڑا تھا۔ کھیتوں میں مکئی کے پودے چپ چاپ کھڑے تھے۔ کناروں پر پیلی پیلی گھاس کسان کے ہاتھ اور درانتی کے نغمے کی منتظر معلوم ہوتی تھی۔ کچّے گھروں کی چھتوں پر اودے رنگ کی بجری ڈھلتی ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ان چھتوں کے کناروں پر کہیں کہیں پیلی، سبز اور سُرخ آلیں رکھی ہوئی تھیں یا گول گول سُرخ مرچیں۔ مسافر نے پھر نگاہ پھیر کر بانو اور بیری کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "موضع دھیلر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

بانو نے اُداس لہجے میں کہا۔ "کوئی تین چار میل۔"

بیری بولی۔ "دن ڈھلتا جا رہا ہے۔"

مسافر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "خدا حافظ۔ ابھی بہت وقت ہے۔ اگلے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

مسافر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ یہ پگڈنڈی گھاٹیوں میں سے گزرتی ہوئی چیڑھ اور کاؤ کے جنگلوں میں چھپتی ہوئی کبھی نیچے کبھی اوپر آگے جا رہی تھی۔ پہاڑ کے آخری موڑ پر نیلے آسمان کے ساتھ مل جاتی تھی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ پگڈنڈی کی خواہش اِک سعیِ ناتمام نہ تھی۔ اُسے معلوم ہوا کہ یہ پگڈنڈی پہاڑ کے کونے پر مُڑ نہیں جاتی بلکہ سیدھی نیلے آسمان میں سے گزرتی ہوئی آگے جا رہی ہے۔ مسافر کا دل کسی نامعلوم مسرّت سے لبریز ہو گیا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ وہ اسی راستے سے گزرتا ہوا نیلے آسمان کی پگڈنڈی پر چلتا جائے۔ حُسن کی کسی نئی دُنیا میں ـــــ اُسے خیال آیا کہ پہاڑ کا وہ کونا جہاں یہ پگڈنڈی بظاہر ختم ہو جاتی

ہے۔ ایک لا تنا ہی نیلی جھیل کا کنارہ ہے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے اُسے ضرور عبور کرے گا۔ وہ اس میں تیرتا ہوا اور نیلے پانی کو اُچھالتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ یا شاید یہ نیلا آسمان ہی ہو۔ تب بھی وہ اس خوبصورت آسمان کی نیلاہٹ میں ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بن کر اُڑ جائے گا اور چاروں طرف پھیلتا جائے گا اور اُس کے دل کی خوشی بڑھتی جائے گی حتےٰ کہ وہ نیلے آسمان کی روح میں گھُل جائے گا اور مسافر اِس اس عجیب احساس کی خوشی میں ایسا معلوم ہوا کہ اس کا سارا جسم ہلکا، لطیف اور غیر مرئی بن گیا ہے۔ اور وہ تیزی سے پگڈنڈی پر چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگنے لگا۔

پھر یکایک وہ ٹھٹک گیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا ــــــ

سورج چوٹی پر غروب ہو رہا تھا۔ جنگلی گلاب کی بیلوں کا سہارا لئے دو سونے کی مورتیں اُس کی طرف تک رہی تھیں۔ جھٹپٹے کے عالم کی خامشی میں اُس کے قریب سے گذرتی ہوئی ہوا اداس معلوم ہوتی تھی، اُداس اور میٹھی، جیسے اُس نے جنگلی پھولوں کی ڈنڈیوں کا سارا شہد باہر کھینچ لیا ہو۔ ساری فضا میں جنگلی گلاب کی خوشبو اور شفق کی رنگینی گھُلتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ وہ کچھ عرصہ ایک جگہ کھڑا اُن کی طرف تکتا رہا۔ پھر اُس نے بازو گھُما کر اُنہیں سلام کیا۔ اور راستے پر مُڑ گیا۔

لیکن اب اُس کے دل کی غیر معمولی خوشی میں ایک عجیب اُداسی سی بھی آ گئی۔ اور اُس کے قدم بھاری ہو گئے اور وہ چلتے چلتے خوشی اور غمی کی ان دونوں حدوں کے درمیان کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ نہ ہی عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں اور نہ ہی گلاب کے پھول۔ بلکہ وقت کے ایسے ہی چند ایک لمحے جو زندگی کی اندھیری رات میں روشن ستاروں کی طرح جھلملاتے رہتے ہیں۔

کرشن چندر

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے، لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دل چسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دل چسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانہ کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے ”چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے۔“

”آٹھ سال۔“

”کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟“

”ساٹھ اور دو باسٹھ۔“

”مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟“

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی نہیں لکھ سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لیے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لیے، اپنے پھٹے پھٹے بدہیئت پاؤں لیے، اپنی سوکھی

ٹانگوں پر اُبھری دریدیں لیے، اپنے کولھوں کی اُبھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں پر ننگی چندیا اُبھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک، کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے۔ شیطان کے چہرے، اس کے ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے۔ اس کی چار دیواری میں اپنے دیے جلا کر چلے گئے۔ لیکن کالو بھنگی بدستور جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے، اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے۔ اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے، بچپن سے، بڑھاپے سے، موت تک اس نے ہر اجنبی کو، اس کے دروازے کے گھر تک دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں۔ اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی ذوق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے

جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا، کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لیے جنگل لے جاتا، اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانہ میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اُسے کھا کر سو جاتا، بتیس سال سے اُسے یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ، اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اُسے ٹالتا آیا ہوں۔ لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ پر اس لیے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ دراصل اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے، مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاوش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے میرے ذہن میں کھڑا ہے۔ نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان سجائے تھے۔ اور یرقانیت کے رومانی نظریے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حُسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا، اُس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صمٌ بکمٌ۔ مگر یہ اب جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا، اب میں اس کے بارے میں لکھ

رہا ہوں۔ للّٰلہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، میٹھی کہانی بھی سن لیجیے، تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہوجائے، اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباواجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس پہلے سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے، اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے، اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹوا کر اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے

ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا، اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لیے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے، لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ دکھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی ——— اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں، جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچّے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں، راستے میں، وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر مُنھ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتّیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے۔ اور بکری کے مُنہ میں ڈال رہا ہے، اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ برابر باتیں کیے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی کبھی غرا کر، کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دُم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا سا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیونکہ بچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس کے اور قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا

کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے، اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اُتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جُگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئیٹر بُن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کُتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتّوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا، اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتّوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اُسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکّی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا، لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو۔ اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتّے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دل چسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، لیکن کالو بھنگی اس سے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور، چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اُسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی ہنولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، سنگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ مخی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکراتاینن سے بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچّے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکّی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکّی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس، نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشتاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اُسے بھونتا تھا، جیسے برسوں سے وہ اس بھٹے کو جانتا تھا، ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے

پیش آتا، گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی اپنا بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بد ذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ، کہ انھیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بُھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا، اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بُری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لیے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دل چسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دل چسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دل چسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے فاؤنٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمھاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کیسی چھوٹے صاحب؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی۔"

"نہیں چھوٹے صاحب۔" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلیے، ممکن ہے........!)

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" —— وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے —— "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں،......

ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"۔

"ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہییں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہییں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے"۔

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکّی کے پراٹھے کھاؤں گا، کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔"

اب بولیے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور چمک دار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"۔

"کیوں؟"

"اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے"! (لیجیے یہ راستہ بھی بند ہوا۔)

"تمھارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لیے جی چاہتا ہے تمھارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہو گی تم نے،

جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی"۔

"عشق کیا ہوتا ہے چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ"۔

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟" شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ بھی عشق کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سُنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟"...... (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمھیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس چھوٹے صاحب!"

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اُٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوادیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا ڈال دیتا اور ایک چپراسی اسکے لیے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگادیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لیے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیونکہ کوئی اس کا وارث نہ تھا، اور جب وہ مرا اُس روز بھی ہسپتال کھُلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کیے۔ مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آکر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا اور ریڈیو سُنا۔ اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اُٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوادی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

"ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ جو میں تمھاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمھارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی — کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا۔ جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچّے کے پیار میں ہوتا ہے، غالبؔ کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمھاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں اور کیا لکھوں؟ تمھاری تنخوا آٹھ روپے اور چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئیے کا، آٹھ روپے ہو گئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمھارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ بتیس۳۲ روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا، وہ جوان ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے، سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے، وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمھیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الّڑھ جوانی، چار کوس سے سنیما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بیوقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو۲ نوجوان کا عشق قبول کیے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اُس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع یقینی امر سمجھتے ہیں درآنحالیکہ یہ عشق بہت بڑا متذبذب، غیر یقینی گو مگو حالت کا حامل ہوتا

ہے۔ یعنی عشق اِس سے بھی ہے، اُس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گربُگی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی اُدھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے، لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لیے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لیے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بیتاب ہو اُٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے، اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی تھم جائے، اور سانس رُکتے رکتے رک سی جائے، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دَھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی باہوں میں بھینچ لے۔ ہائے —— پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی، اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی —— نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہو لہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھُری سے اُسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے مگر وہ بچ گئی، کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں —— خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم، کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی

ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں، ریشماں کا تو ایک بچّہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے اور خاوند کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا، اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا، جانکی کو پھولوں سے بڑی محبّت تھی، وہ ہر روز صبح اُٹھ کے مُنہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوب صورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمار داری لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دیے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اُس نے مُڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی مُنہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی وہ اسی شدّت، اسی خلوص، اسی اذیّت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا، لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رُکی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بہ روز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی، اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی۔ سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سُرخی آتی گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور اس کے پاؤں کی پٹی اُتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں پر کاجل لگایا اور بالوں پر زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرّت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔

نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے، اس سے معافی مانگنے کے لیے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لیے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی، اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا۔ اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا۔ اور پٹواری بھی۔ اور وہ دونوں خرد ماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کیے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی ــــ سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور سیکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پُر کیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ:

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔ اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اُٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا، پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں پھر اور کیا لکھوں تمھارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا۔ جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم رہے ہو۔ تمھاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمھیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرّت اور اس مسرّت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمھارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمھارے آٹھ روپے میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گُڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنیے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمھاری کالو بھنگی، تمھارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ۔ دیکھو میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی بھونڈی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں، شاید اب تیرے لیے مجھے بتیس ۳۲ روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑیگا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ڈیسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اُسے ڈبل بھتّہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں

اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیس اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے، بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اُسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لیے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اُسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کیے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہو گئی، پھر کر کری پڑنے لگی۔ اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

"اماں" ـــــ بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

"اماں" ـــــ بخت یار چلایا۔

"اماں" ـــــ کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا ـــــ "میرا خیال ہے وہ نگر گئی ہو گی تمھارے ماموں کے پاس"۔

نگر کے دو کوس اِدھر انھیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی، آگے بڑھتی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لیے مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بیہوش ہو گئی۔ بخت یار کی بیوی نے اُسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اُسے باری باری سے اُٹھاتے چلے آئے، بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور اُنھیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا،

اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور وہاں سے چلا آیا۔
ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی
مَیں تمھارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں، لیکن تمھارے متعلق اتنا کچھ کُریدنے کے بعد بھی
سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کیا کیا جائے، خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہانی سُننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں سُن، تو چاہتا ہے تاکہ کوئی تیرے گندے، کُھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر اُن سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی اُبھری ہوئی ہڈّیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے، انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے۔ تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے اِرد گرد ایک چھوٹی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ، اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچّے قہقہے لگاتے پھریں، تو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر جوڑتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیّل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتّیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اسکی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے مکّی کا بُھٹّا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت اور شفقت سے وہ بُھٹّا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننّھے بچّے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا مُنہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں

دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا، ——— یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تُو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھُجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات۔ آٹھ۔ آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی، کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، ایک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور تختہ پاک اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکان دار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیئے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اُٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت، اپنی بلندیاں چھُولے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لیے یہاں کھڑا رہے گا۔

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھُڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

راجندر سنگھ بیدی

اپنے دُکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پُھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شالوں میں لپیٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جا رہی تھی۔ باہر چکلی بھابی، دریاباد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھُل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں، اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کی نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا ——
"کہاں، کہاں لیے جا رہی ہو مجھے؟"

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک بہن کو بسانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو، جس کی طرف بارش کے لئے مُنہ اُٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منّتیں ماننی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکاجی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا —— ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کا راستہ بتانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا، دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اُسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے، جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے

جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اُس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دُلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ جبھی اس نے سوچا ـــــ اندو میری بیوی ہے، کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھوتے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالوں میں لپٹی ہوئی دُلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، یہاں اندو کا مُنہ ہو گا اور جب ہاتھ بڑھا کر اُس نے پاس پڑی گٹھری کو چُھوا تو وہیں اندو کا مُنہ تھا۔ مدن نے سوچا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا، جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو، اور کسی خیالی بھینس کو سونگھتے رہنے سے اُسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب، اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پر چہرہ لمبوترہ ہو جاتا ہے بس یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لیے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں کے بیچ ایک سایہ دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی، جیسے دو سرسبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا، لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال ـــــ

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا۔ جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لیے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اُٹھا لیا اور شرابی کی سی آواز میں کہا ـــــ "اِندو!"

اِندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اِندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اتنا سا کہا ـــــ "جی" ...... اُسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سُنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی وہ تھمنے میں ہی نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اِندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا، لیکن اِندو

طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا، جو اُسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی " جتنی دیر زندہ رہی بچاری" مدن نے کہا ـــــ " بابو جی کے ہاتھ میں دوا کی شیشیاں ہی رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بِل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ـــــ ۲۸ مارچ کی شام ......!" مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا اِدھر اور گھگھی سے ذرا اُدھر پہنچ گیا۔ اِندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اِندو کو بھی اپنے پن سے اِدھر اور بیگانے پن سے اُدھر پہنچا دیا تھا۔........ مدن اِندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اِندو نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا

"میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابھیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لیے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں ...... میں اب تمھاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔"

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریا دلی کے مِلے جُلے شبدوں میں کہا:

"کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔"

"پکّی بات؟" اندو بولی۔

مدن نے کچھ اُتاولے ہو کر کہا ـــــ "ہاں، ہاں ـــــ کہا جو پکّی بات۔"

لیکن اِس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا ـــــ میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اِندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟

لیکن اِندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھ میں سمیٹتے اور ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا ـــــ

"تم اپنے دُکھ مجھے دے دو۔"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے آپ پر سے ایک بوجھ بھی اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اِندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا۔ یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہوگا جو اِندو نے کہہ دیا۔ جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اِندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا ـــــ

"دیے" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابھی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کے اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریاباد والی پھوپھی جو اپنے "نو لکھے ہار" کے گم ہو جانے پر شور مچاتی، واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے، جن کو ان کے جے۔ پی ہونے کی خبر تار کے ذریعے سے مل گئی تھی جو شاید بد حواسی میں مدن کے بجائے دلہن کا منھ چومنے چلے تھے ——

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی اور چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابھی ہی کے بغل میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کون سی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے، اور دیکھے تو کتنی دیر دیکھے، یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔ لیکن کالکاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جاتے مدن کے سامنے رک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندو انھیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگھٹ کھینچ لیتی، لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دکھائی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آ لیا تھا اور دھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں پر خریدنے پر تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر مدن جلد ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا —— گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جبھی وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو —— بھابھی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور آج وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابھی کے

سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا ـــــ "کھاؤ تم" ـــــ وہ کہتا ـــــ "وہ بھی کھالیں گے۔" اور پھر رسوئی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی، تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے ـــــ "رہنے دو بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔" اندو کہتی ـــــ "نہیں بابو جی، میں ابھی کیے دیتی ہوں، چھپاکے سے۔" تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز سے کہتے ـــــ "مدن کی ماں ہوتی بہو تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی؟" .... اور اِندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابھی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دُلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چکلی بھابھی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اِندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچّہ سمجھنے لگی تھی۔ جب سے وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اُٹھتا، اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا، پاس نہ آتا نہ دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق ہے، ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے ـــــ "ارے جانا ـــــ بھابھی پیار کرتی ہے، ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو .... ؟" اور دُلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس کے ـــــ "میں تو بھابھی کے ساتھ ہی سوؤں گی"۔ کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اسی بات پر دُلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچّی آدھی پکّی نالی میں جا گری۔ اِندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے دوپٹہ اُڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ "بابو جی !" ـــــ اِندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا ـــــ ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے ماں کی بچّی کو چھاتی سے لگاتے ہوئے اِندو نے اُسے ایک بستر میں سُلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے اکیلے ہی تکیے تھے۔ نہ کہیں پائینتی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف، کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اِندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی اُسے دُکھا بھی رہی تھیں، اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دُلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے سے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ـــــ "ہائے ری مُنّی! تیری ساس

مرے۔ کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں۔ تیرے گالوں پر ــــــ!" منّی نے منّی ہی کی طرح کہا۔

"گڑھے تمھارے بھی تو پڑتے ہیں بھابھی!" ــــــ

"ہاں منّو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصّہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سُن رہا تھا بولا ــــــ

"بس تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے!"

"کیوں، اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔

"ہاں۔ نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری...... ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔"

اِندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا ــــــ "تم جاؤ جی سو رہو جا کے، بڑے آئے ہو...... آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا، مرگھٹ کی چُپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نا، رسوئی میں تمہارا کیا کام؟"

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چٹھیاں سارٹ ہوئی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اُسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اِندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی جب منّی کو سُلانے کے لئے اِندو کی لوری سنائی دی ــــــ "تو آنند یارانی، بورائی مستانی......"

ــــــ وہی لوری جو دلاری منّی کو سُلا رہی تھی۔ مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اُس نے زور سے چادر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس بند کر لینے سے خوامخواہ ایک مُردے کا تصوّر پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اُس کی دُلہن اِندو اُس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر گرتی پڑتی، روتی چلاتی رسوئی میں جاتی ہے اور چولھے کی راکھ سر پر ڈال لیتی ہے، پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلّے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے ــــــ "لوگو! میں لُٹ گئی۔" اب اُسے دوپٹے کی پروا

نہیں، قمیص کی پروا نہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چوڑیاں سب ننگے ہوچکے ہیں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اُڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے حالانکہ رسوئی میں اِندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دُنیا میں واپس آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا......

ادھر اِندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی۔ ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اِندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اسے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا...... وہ پھر اپنی دُنیا میں لوٹا جس سے ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔ ــــــ "اندو"...... اور پھر چپ ہوگیا۔ اس ادھیڑ بُن میں وہ بورائی مستانی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ ہی آئی تھی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی سبطے کی بھینس منھ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے سر کھجاتے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا ــــــ سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اِندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لیے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہوگیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اُٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ میں پُھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصّے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"سو تم ــــــ آگئیں؟

"ہاں!"

"منّی ــــــ سو مر گئی؟"

اِندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہوگئی ــــــ "ہائے رام!" اس نے ناک پر انگلی رکھتے، ہاتھ ملتے ہوئے کہا ــــــ "کیا کہہ رہے ہو؟...... مرے کیوں بے چاری؟ ــــــ ماں باپ کی ایک ہی بیٹی۔"

"ہاں !ـــــ" مدن نے کہاـــــ" بھابی کی ایک ہی نند"۔ اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولاـــــ" زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں، اس میں کیا پاپ ہے ؟"

"یہی پاپ ہے"۔ مدن نے اور چڑتے ہوئے کہاـــــ" پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب دیکھو، جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے، دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہاـــــ" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔ بے چاری دو دن کی مہمان آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ایک دن چل ہی دے گی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں، باپ، بھائی بہن، چچا تایا سبھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دُلاری تھی جو پلک جھکتے ہی نیاری ہوگئی اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں جیسے گھر میں کوئی بڑی سی بامبی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھینکوا نہیں جاتی گھر کے لوگ آرام کی نیند نہیں سو سکتے۔ دور سے کیلنے والے تھن کرنے والے، دانت پھوڑنے والے ماندری بلائے گئے۔ بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگرـــــ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی، جس میں گوٹے کناری میں لپٹی ہوئی ایک دُلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی .....

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہاـــــ" تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے۔؟"

"ہاں !" اندو نے اثبات سے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے ...... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں ـــــ"

"دکھاوا ہے یہ سب ـــــ ہاں !"

"اچھا جی ؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہاـــــ" یہ سب دکھاوا ہے میرا ؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اِندو خود ہی اُٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی ــــــ "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو ــــــ ہوا کیا ہے تمہیں ....؟"

شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آ گیا ــــــ "جاؤ جاؤ ــــــ سو جاؤ جاکے" ــــــ مدن نے کہا ــــــ "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمہیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے، مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی "زندگی بھر لینا ہے۔" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس طرح مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہے۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی ــــــ

"پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو ــــــ تمہاری تو ــــــ" یوں معلوم ہوا جیسے اِندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا ــــــ "کیا کہا؟" اور اِندو نے اب کے سُنائی دینے والی آواز میں دُہرا دیا۔

مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اِندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی ــــــ

"تم مرد لوگ کیا جانو؟ ــــــ جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی، کیا بہن" ــــــ اور پھر ایکا ایکی دور دیکھتی ہوئی بولی ــــــ

"میں تو دُلاری منّی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہو گئی۔" مدن نے کہا ــــــ "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں؟"

"تمہیں ایک ہاتھ کی دِکھتی ہے نا؟" اِندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی ــــــ "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو ــــــ" مدن نے

سچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جب دیر تک نہ کھولیں تو اِندو بولی ــــــ "اب کھولو بھی، اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" جبھی مدن نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے سامنے اِندو نہیں، کوئی اور بیٹھی ہے۔ وہ کھوسا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لیے۔" اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی ــــــ "تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ .... یاد نہیں اپنا وچن؟ ــــــ تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں!" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اِندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا، ساتھ ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لیے اِندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی کسی وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بُنا ہوا آہوں کے دھوئیں سے رنگین، قہقہوں کی زرتاری سے چکا چوند، جو ہر وقت اِندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لیے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گر پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور ــــــ

.... مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے جنھیں سکھانے کے لیے وہ انھیں اوپر ہوا میں بڑھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھٹتی ہوئی پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا ــــــ اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لیے پاس، اِبتذال کے لیے دور .... کبھی اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اِس قسم کے فقرے ہوتے ــــــ

" ہائے جی ! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے ؟"

مدن کہتا ــــــ چھوٹے سمجھتے نہیں، بڑے سمجھ جاتے ہیں ــــــ"

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارن پور ہو گئی۔ وہاں ریلوے میل سروس میں سیلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کُنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگے پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی۔ بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے ہی انھیں بیچ میں سے اُٹھانا ان کی پڑھائی کے لیے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کو دل کے دَورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارن پور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چہک اُٹھی۔ کہاں اُنھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت ہی تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے، بچوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اُتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے، اپنے مدن سے دور، السیائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی ــــ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے باہر کی طرف منھ اُٹھا اُٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ کے تلے، جو آنگن میں سینکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے کھڑا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کُھلتا تو کنواریاں، نئی نیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں ــــــ " جھولا کن نے ڈاروا ے امریاں" اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو دو جھولتیں اور دو دو جھُلاتیں۔ اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں ــــ ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے جبھی وہ مُنھ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں

بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اُسے جگاتے اور اُٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پاکر اس کی شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے ہمیشہ وہ اپنی ساس والے پُرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھاکر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں، لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مُڑتے تو نگاہ نیچے کونے میں بہو کے محرم پر جا پڑتی تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچّہ بل سے باہر آگیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سُنائی دینے لگتی ——— "اوم نمو بھگوتے واسو دیوا ———"

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے ——— "ہم تو دھنیہ ہو گئے امی چند کی ماں! شکر ہے کہ ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل۔ نگاہ قریب آتی تو اُنھیں موٹے موٹے گدرائے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اُترتے محسوس ہوتے ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کوٹھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جارہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، سبھی ایک سے جُڑواں ——— توام ...... اوم نمو بھگوتے ———

آس پاس کے سب لوگ جان گئے تھے اِندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اِندو سے کہا ——— "بی بی! میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو، اللہ تم کو اجر دے گا" ——— اِندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہوگیا، وہ بھی سارٹر ——— جو نہ ہو سکا اُس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اُس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اِندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لیے اُس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اِندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اُٹھتی اور کہتی ———

"نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تیرا تو سسر بھی پیے گا۔" وہ مذاق سے کہتے۔

"تو پھر آپ پی لیجیئے نا۔" اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصّے سے برس پڑتے ——— "تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟"

"ہوں ——— ہوں ———" اِندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اِندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اُسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ——— " اور لے، یہ پڑا ہے ——— تیری مرضی ہے پی ——— نہیں مرضی تو نہ پی"۔ کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام، دلاری منّی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دُلاری کی بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منھ رکھ کر پھسکڑا پھیلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور مُنّی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو مُنّی نے بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "دودھ تو کھراب ہو جائے گا بابو جی ——— بھابھی تو پیتی ہی نہیں"۔

"پیے گی، ضرور پیے گی بیٹا! ———" بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو پلٹاتے ہوئے کہا ——— "عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں"۔ ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منھ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے "ہش ——— بے خصم کھانی" کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا، بہو بلّی کو بھگا رہی ہے ——— اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو ——— بھابھی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر بعد کندن، بابو جی کے پاس آتا اور کہتا ———

"بو جی ——— بھابھی رو رہی ہے"۔

"ہائیں؟" بابو جی کہتے اور پھر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے ——— "جا تو سو جا ——— وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ ———"

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے

اور اپنے من کے بھگوان سے پوچھتے ــــــ "چاندی کے اِن کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟" اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤ ہو کی آواز سنائی دیتی جیسے سُنتے ہوئے وہ کہتے ــــــ جب سے دُنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!" ــــــ اور وہ روتے روتے سو جاتے۔

اِندو کے جانے کے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کردیا۔ اُس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے قبض ہوگئی ہے۔ گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابو جی کے ایک دوست سے تصدیق کی ہوئی چٹھی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار ــــــ جوابی

جوابی تار کے پیسے مارے گئے، لیکن بلا سے۔ اِندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اِندو سے سیدھے مُنھ بات ہی نہ کی۔ یہ دُکھ بھی اِندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پاکر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی ــــــ "اِتنا مُنھ پھُلائے بیٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھُڑاتے ہوئے کہا ــــــ "چھوڑ ــــــ دُور ہو جا میری آنکھوں سے کمینی ــــــ"

"یہی کہنے کے لیے اتنی دور سے بُلوایا ہے؟"

"ہاں!"

"ہٹاؤ اب"

"خبردار ــــــ یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ تم جو آنا چاہتیں تو کیا بابو جی روک لیتے؟"

اِندو نے بے بسی سے کہا ــــــ "ہائے جی ــــــ تم تو بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بُلوا کر بابو جی پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں ــــــ ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچّوں میں۔"

"اور میرا جی ــــــ؟"

"تمہارا جی ـــــ ، تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔" اِندو نے شرارت سے کہا اور کچھ اس طرح سے مدن نے دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اُسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اِندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

"بابو جی تم سے بہت خوش تھے۔"

"ہاں!" اِندو بولی ـــــ "ایک دن میں جاگی تو دیکھا تو سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم!"

"اپنی نہیں میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو میں نا کھاتی ـــــ کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا ـــــ "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پوچھا ـــــ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ہائے رام!" اِندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ـــــ "گندے کہیں کے ـــــ شرم نہیں آتی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"بابو جی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اِندو نے بابو جی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا ـــــ "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمہارا من گندہ ہے۔" اِندو نے نفرت سے کہا ـــــ "اِسی لئے تو تمہارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اِس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی .... وہ تھا نگوڑا ـــــ جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے؟" اور پھر اِندو بولی ـــــ "بابو جی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔ وہ دُکھی ہوں گے تو کیا تم دُکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے مدن کے بڑا ہونے کے

کے کارن سب سے زیادہ اثر اسی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا ـــــ اور نمو بھگوتے واسو دیوا۔ اور نمو...... اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اُٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پاتا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اِندو سے صرف اتنا کہا ـــــ ابھی رہنے دو بابوجی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی سے مل سکے ہیں۔"

تیسرے چوتھے بابوجی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں ڈھل گئے تھے۔ لکھا تھا ـــــ

"بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پُرانے دن لوٹ آئے تھے ـــــ تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور پتاجی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق... وہی بیسیوں خلجگن .... میں بازار آجا رہا ہوں، کچھ نہیں وہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا صندوق پڑا تھا، خالی ہے.... ...... اور پھر ایک آدھ سطر اور دُھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا ـــــ دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے مَن میں ایک ہول سا اُٹھتا ہے........ اور پھر ـــــ بہو کا خیال رکھنا، اُسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اِندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی، سانس کھینچی، آنکھیں پھیلاتی، شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بولی ـــــ "میں مر گئی، بابوجی کو کیسے پتہ چل گیا؟"

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا ـــــ "بابوجی کیا بچے ہیں؟ دُنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر۔" اِندو بولی ـــــ "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں؟"

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر بابوجی یا کوئی دیکھ رہا ہو، اس نے ساری کا پلّو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی ـــــ "تمہاری سُسرال سے

شسیر بھی آئے گی ۔"

"میری سسرال ؟ ___ اُوہاں۔" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا ___ "کتنی شرم کی بات ہے ۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے اور چلا آیا ہے۔" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو ؟"

"تم ___ یہ سب قصور تمہارا ہے ۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں ؟"

"ایک دم نہیں ۔"

"کیوں ؟"

"چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے ۔"

"کیا یہ جندگی کا مجا نہیں ؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ مرد عورت شادی کس لیے کرتے ہیں ؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا ؟ پوچھو اُن سے جن کے نہیں ہوتا ۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں ؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں ۔ سادھوؤں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی، شرم و حیا کو تج کر، دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی ___ شمشانوں میں مسان جگاتی ___"

"اچھا ! ___ اچھا ۔" مدن بولا ___ تم نے بکھان ہی شروع کر دیا ۔ اولاد کے لیے تھوڑی عمر پڑی تھی ؟"

"ہوگا تو !" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا ___ "جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا ۔ وہ تمہارا نہیں میرا ہوگا ۔ تمہیں تو اس کی جرورت نہیں ۔ پر اس کے دادا کو بہت ہے ۔ یہ میں جانتی ہوں ۔"

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا مُنھ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پالینے کے سلسلے میں ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چُپ چاپ بیٹھا رہا ۔ ایک لفظ بھی اس نے مُنھ سے نہ نکالا ۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ اُٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی ___ "وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں ......

مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔"

مدن جیسے خائف ہو گیا۔"یہ خوبصورت چیز" جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے مر جائے گی ؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا ___ "تجھے کچھ نہ ہو گا اندو......... میں تو موت کے منھ سے بھی چھین کر لے آؤں گا تجھے ___ اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے ___"

مدن سے لپٹ کر اندو بھول گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دُکھ ہے ....

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا، البتہ سہارن پور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو قریب قریب وہ چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی، سارٹر کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں مُوند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا ___ "اوم نمو بھگوتے........"

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی ___ "بابو جی! چلے آؤ........ بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی ___" لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی ہی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے....... ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساسِ جُرم بڑھنے لگا ___ "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑتا ___ ؟"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کی حالت میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچّے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی ___ "مبارک ہو بابو جی! ___ لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا ؟" مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بولا ___ "بی بی کیسی ہے ؟"

بیگم بولی ___ "خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے......... زچّہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا ؟"

"او......." مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اُسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی ___ "تمہارا اندر کیا کام ؟" اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں اور وہ خوف سے نہیں تسلّی سے۔ یا شاید

جب کوئی اِس دُنیا میں آتا ہے تو اِرد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سُن رکھا تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے درو دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں......... زچگی کے لئے چکلی بھابھی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا۔ البتہ دریاباد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام۔ رام رام کی رٹ لگادی تھی اور اب وہی رٹ مدّھم ہو رہی تھی

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی ۔ برآمدے کی بجلی کی مدّھم سی روشنی میں اُس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آ رہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا ــــــ

"اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی ؟"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں بچّے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور نڈھال سی ہو کر منّی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا......... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اُٹھی ہے ــــــ ؟

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بُو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں سے کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اُڑ گئے۔ اُسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کُھلی تھیں پر کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی کچھ مرگھلی سی آواز آئی۔

ــــــ "ہا ــــــ ئے !" اور پھر بچّے کے رونے کی آواز ....

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبایا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا لیکن اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بُو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اُسے ہوش آیا ہے۔ کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اِندو ــــــ نند اور جسودھا ــــــ

اور دوسری طرف نڈھال .... اِندو نے بچّے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے انداز میں بولی ــــ "بالکل تم پر ہی گیا ہے۔"

"ہوگا۔" مدن نے ایک اُچٹتی سی نظر بچّے پر ڈالتے ہوئے کہا ــــ "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا تم بچ گئیں۔"

"ہاں!" اِندو بولی ــــ "میں تو سمجھی تھی ــــ"

"شبھ شبھ بولو! مدن نے ایک دم اِندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے .... میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا" ــــ اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"توبہ کرو۔" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیے .... اور اِندو نحیف سی آواز میں ہنسنے لگی۔

بچّہ پیدا ہونے کے بعد کئی روز تک اِندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچّے کو تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے باہر کی دُنیا میں جاکر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔

اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اِندو شانتی سے اس دُنیا کو تک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دُنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور اب دیوی بن کر دَیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے .... مدن نے اِندو کے مُنھ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا ــــ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دُبلی ہو کر اِندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے .... جبھی ایکا ایکی اِندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لیے

"کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اِندو تھوڑا سا کوشش کر کے بولی ــــ "اسے بھوک لگی ہے۔" اور اس نے بچّے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے؟ ــــ بھوک؟ ــــ" مدن نے پہلے بچّے کی طرف اور پھر اِندو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ــــ "تمہیں کیسے پتہ چلا ــــ؟"

"دیکھتے نہیں؟" اِندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی ــــ "سب گیلا ہو گیا ہے۔"

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بُو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچّے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ "اسے مجھے دے دو!"

مدن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچّے کو یوں اُٹھایا جیسے وہ مرا ہوا چوہا ہو۔ آخر اس نے اندو کی گود میں بچّے کو دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "تم جاؤ...... باہر۔"

"کیوں؟...... باہر کیوں جاؤں؟" مدن نے پوچھا۔

"جاؤ نا ـــــ" اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا ـــــ "تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔"

"ارے؟" مدن حیرت سے بولا ـــــ "میرے سامنے...... نہیں پلا سکے گی؟" اور پھر ناسمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مُڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ـــــ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہ لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کِھل اُٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انھیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منّا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر گولی پندرہ[15] بیس[20] کی تعداد میں روز کھانے کو دیں، پہلے ہی دن انھیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انھیں متلی سی ہونے لگی تھی اور انھوں نے پکارا ـــــ

"بہو! ذرا داتن تو دینا، ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اُٹھ کر داتن چبا رہے تھے کہ ایک ابکائی کیا آئی ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔

مُنے کو پیدا ہوئے کُل بیس چبیس روز ہوئے تھے۔ اِندو نے مُنھ نوچ نوچ کر، سر اور چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اُس نے تصوّر میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اِندو نے چوڑیاں توڑنے کے بجائے اُتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹّی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا ـــــ "لوگو! میں لُٹ گئی" کی جگہ اس نے ایک دل دوز آواز میں چلاّنا شروع کر دیا تھا ـــــ "لوگو! ہم لُٹ گئے ـــــ"

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا، اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر مُنھ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹّی پر اوندھا لیٹ کر، اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا .... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچّے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری مُنّی اور پاشی یوں چلاّ رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چونچیں اُٹھا اُٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی پروں کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو ـــــ

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا، اب تو یہ دُنیا میرے لئے ختم ہو گئی۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس سکوں گا؟ وہ اُٹھا اور اُٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھُس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دُہرایا میں کبھی ہنس سکوں گا؟ ـــــ اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار، محلے والے سَن سے رہ گئے۔

پھر ہندو راج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چِتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کریا کی لاٹھی مارنی پڑی .... عورتیں

باہر ہی شمشان کے کنویں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات بھر گھر آنے پر پھر سے ہوس میں ڈھل گئی...... اُسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی، جنک دُلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا......
اس رات اگر اندو اپنا آپا یوں مدن پر نہ وار دیتی تو اتنا بڑا دُکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں ڈھکیل کر مدن خود اپنا دُکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بُلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا...... کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا ــــ مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا جو کبھی مانی جاتی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا ــــ "مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اُسے کوئی مارتا تو نہیں؟"...... مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل، اَن پڑھ عورت...... ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟ ــــ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا ــــ "کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟"

سال گزر گئے۔ پیسے بھی اتنے نہ تھے کہ اُن سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقّت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا ...... کندن کا داخلہ دینا ہے۔ دُلاری مُنّی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منھ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو ایک طرف سے آتی، مسکراتی ہوئی اور کہتی ــــ "کیوں دُکھی ہو رہے ہو؟" مدن اُس کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ــــ "دُکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی۔ اے کا داخلہ دینا ہے...... مُنّی"...... اندو پھر ہنستی اور کہتی ــــ "چلو میرے ساتھ" اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو

صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا ——— "مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا!" اور اندو کہتی ——— "ہاں لے جاؤں گی۔" پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے...... تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ ......"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ اپنا کام چلاؤ۔"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی ——— "میں نے ایک سیٹھ کو دوست بنایا ہے نا!" اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی ——— "میں چور لٹیرا ہوں ——— تم نہیں جانتے؟ ——— سخی لٹیرا ——— جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غربا کو دے دیتا ہے۔"...... اسی طرح منّی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اتر بھی گیا ......

ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی "ہتھ بھرا" کرتی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا ——— "تم بہو کے ہاتھ کی پکی ہوئی کھا آئے ہو، اس کا سُکھ بھی دیکھا ہے، پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا" ——— یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انہوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا ——— اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی۔ ——— اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی ......

پھر اندو ایسی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑ جاتی ——— مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی بات میں اُلجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے، اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچے ہی رہتی تھیں ——— جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے، اپنے شہر، دھرم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد

کردے لیکن آخر سبھی سر جھکائے ہوئے اِندو ہی کے شرن میں آتے اور اسی سے پھما مانگتے تھے۔

نئی بھابھی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اِندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابھی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے۔ پی چاچا کی معرفت جائداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائداد تو ایک طرف، اِندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں تقسیم کی زد میں آگئیں اور اِندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے وہاں اِندو کا اپنا گھر دنوں ہی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اِندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اِندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اِندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اُٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اُٹھتی ـــــ "تو مجھے جینے بھی دے گی ـــــ ماں ہ"

اور بچی چلاّ چلاّ کر رونے لگتی۔

مدن اِندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سارو پیہ اِندو سے بالا ہی بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے مُنہ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کبھی اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا۔ کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا مُنہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت

آکر کھڑی ہوگئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آرپار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتّا رونے لگا اور پر طبل نے اُس کی آواز ڈبو دی......

مدن کو اس کے تصوّر کے خدّ و خال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا ہے۔ یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صنّاعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پر مارا۔ اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خوتی تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اُٹھائے اور اِندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیے۔

ایک اندو کے بجائے دو اِندو ہو گئیں۔ ایک تو اِندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اِندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آرہا تھا۔

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہو کر....... نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن، گھمی کی ایک جوڑی جس میں خوشبودار قوام لگا ہوا تھا، مُنہ میں رکھ کر،.......

لیکن اس دن مدن جو گھر آیا تو اِندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پاؤڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر روج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک کے نہ ہونے پر ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں اُن میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

”کیا بات ہے آج ؟“ مدن نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اِندو نے مدن سے بچاتے ہوئے کہا—— ”آج فرصت ملی ہے۔“

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اِندو کو آج فرصت ملی تھی! اور وہ بھی اس وقت جب کہ چہرے پر جھائیاں چلی آئی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ سی کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ آج اِندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر

نہ آتی تھی ۔ یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی ـــــ "یہ نہیں ہو سکتا ـــــ" مدن نے سوچا اور اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اِندو کی طرف دیکھا ـــــ جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی .... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دِکھ سکے تھے .... اندو سچ مُچ خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد، پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور اُن کی بہنیں اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں ...... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر !

آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھے، لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا ...... ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔

مدن نے اُس کی آواز سُن کر آنکھیں بند کر لیں۔ کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر۔ نہیں نہیں، وہ اِندو تھی۔ اپنی ماں کی بیٹی۔ اپنی بیٹی کی ماں۔ جو اپنی آنکھوں کے دُنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اِندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا ...... لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

"اِندو ـــــ!" مدن نے کہا ...... اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز سے دُو سُرا اوپر تھی اور اِندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "جی"۔ اور اُس کی آواز دُو سُر نیچے تھی ...... پھر آج چاندنی کے بجائے اماوس تھی ....

اِس سے پہلے کہ مدن، اِندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اِندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اِندو کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ اِندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ کیا؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا ــــــ "تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔"

"یونہی۔" اِندو نے کہا اور بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ــــــ "رات بھر جگایا ہے اس چڑیل میاں نے۔"

بچّی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا دم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اِندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــــ "ہاں مگر ــــــ یہ آنسو ــــــ؟"

"خوشی کے ہیں۔" اندو نے جواب دیا ــــــ "آج کی رات میری ہے۔"

اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذّذ کے احساس نے کہا ــــــ "آج برسوں کے بعد میرے من کی مُراد پوری ہوئی ہے، اِندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا ــــــ"

"لیکن تم نے کہا نہیں۔" اِندو بولی ــــــ "یاد ہے شادی کی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟"

"ہاں۔" مدن بولا ــــــ "اپنے دُکھ مجھے دے دو!"

"تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔"

"میں نے؟" مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا ــــــ "میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار ــــــ ان کی تعلیم، ــــــ بیاہ، ــــــ شادی، یہ پیارے پیارے بچّے ــــــ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔"

"میں بھی یہی سمجھتی تھی۔" اندو بولی ــــــ "لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" پھر اندو نے رک کر کہا ــــــ "میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔"

"کیا چیز رکھ لی ــــــ؟"

اِندو کچھ دیر چُپ رہی اور پھر اپنا مُنھ پرے کرتے ہوئے بولی ــــــ "اپنی لاج ــــــ اپنی خوشی .... اس وقت تم بھی کہہ دیتے ــــــ اپنے سکھ مجھے دے دو۔ ــــــ تو میں .... اور اِندو کا گلا رُندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی ــــــ "اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔"

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا ـــــ یہ ان پڑھ عورت ـــــ ؟ کوئی رٹا ہوا فقرہ ـــــ ؟

نہیں تو .... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں بُرادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا ـــــ "میں سمجھ گیا اِندو ـــــ!"

پھر روتے ہوئے مدن اور اِندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اِندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ایسی دُنیا میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے.......

راجندر سنگھ بیدی

ببّل

دربار ی لال شام سے گھر ہی میں بیٹھا، سیتا کے ساتھ بے کار ہو رہا تھا۔
کسی کے ساتھ بے کار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

——— سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک ۶ بجے آردرا سینما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہوگی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کاسنی ہوگا، لیکن ———

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہشوری ادیان ہو گیا ہے۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہ تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لیے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لیے جو اب تک کھنچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کے ساتھی مہتا صاحب کے مکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے۔ ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ روپیہ اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے۔

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی، جنھوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنا یا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی نار، ایک کھ پتی اسماعیلی صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلّے، پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو "پریم گنٹیر" ——— اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منوتی ہوگئی۔ لڑکے کے رشتہ دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے کو شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری موہن یا صالح محمد اپنا نام ہمیشہ ایس۔ ایم نواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر غصّہ نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے

درباری لال کے حواری جب بھی ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے "کیوں بے صالح.......؟"

آج صالح یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس سمے بہاری اور بھابی گن وتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں مثالی مرد اور مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں اُلجھنے لگیں۔ درباری برآمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ لپکا اور اپنے منھ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا ——— "میں درباری لال مہتا، ولد گردھاری لال مہتا، ساکن بمبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔" سب اس آواز پر چونک گئے۔ عورتوں اور بچّوں کی تو جان ہی نکل گئی۔

درباری لال واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق اُلٹنے لگا اور پھر اردرا سنیما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اُسے کاسنی رنگ کی ساڑی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آکر شامل ہو گئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پہ ہیر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا، قینچی لے کر آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے، عمر کے اس حصّے میں لڑکے لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی سی۔ پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جاکر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں...... درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں، یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے ——— بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل، بے قاعدہ اور کھردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لیے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چیپھیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں..... جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیص اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لیے گرجے کی طرف جا رہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر بچّوں کو فٹ بال

کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجادی، کھیل ختم کر دیا مگر سیتا نہ آئی ......

اردرا سنیما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھیں اور جگالی کر رہی تھیں۔ پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جبھی ایک موٹی سی عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک، راما سوامی آرہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک راما سوامی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ تاہم یہاں درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے، ڈھکیلتے، کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے آرہے ہیں۔

سیتا کے بجائے اُلٹی طرف سے مصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح، آج بھی اس کی گود میں بچہ تھا — ببل!

ببل ایک تندرست بچّہ تھا۔ گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے تو کئی دانت نکال لیے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً بڑے سے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا، جو ببل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببل"۔ درباری نے پکارا اور ہاتھ بچّے کی طرف پھیلا دیئے۔ مسکراتے ہوئے ببل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بس سی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری سے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو"۔ درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لیے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔ ببل کے چہرے پر ایک پُر خلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو — یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببل کی ماں، مصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببل ایک ریہرسل کیے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا۔ نظریں بچاتا۔ پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مصری بابو کے چلے جانے کے بعد

ببّل کے ہاتھ سے وہ چھین لیتی ——— ببّل روتا چلاّتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببّل اور اُس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کُرمرالے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا، کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دوّنی یا چوّنی مل جاتی تھی جس سے ببّل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرمرا چاہیے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دکان دار کو دیتی تھی۔ کرمرا وہ سیدھا مُنہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پپولتے ہوئے اُسے ہمک ہمک کر، اچھل اچھل کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببّل کو گود میں اُٹھایا تو ایک ہی بار میں کرمرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری نے ببّل کو بہت روکا، پیار دُلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا ———

درباری نے کہا ——— "کمینے ...... سالے ......"

اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی "کیا حکم ہے حضور؟"

"آپ کو عرض نہیں کیا، فیض گنجور"۔ درباری نے اندر کی طرف مُنہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر ببّل کے پیارے، دُلارے گالوں پر چپت لگاتے، اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا ——— "اتنا خود غرض؟ ...... سلام نہ دُعا، شکریہ نہ دھنیہ واد ...... کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟"

مصری فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم کو جس کے لیے ایک تکلف بنا دیا تھا۔ بے باکی سے بولی۔ "یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابو جی!" اور پھر ببّل کو چھاتی میں چھپاتی، وہیں کھڑی وہ اپنی دوّنی یا چوّنی کا انتظار کرنے لگی۔

ببّل ہمیشہ کی طرح الف ہنیں تو ب ننگا ضرور تھا کیونکہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔ اس "لباس" میں خوش، ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے۔ پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لینے لگا۔ یورش سے پہلے ہی جس کے چھکّے چھوٹ گئے۔ پھر ایکا ایکی کسی پروں والے خیالی گھوڑے پر بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر، ...... اور ہر لیں تسخیر

ہو ہو کر اس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں۔

مصری ایک پکّے بلکہ کالے رنگ کی ایک جوان عورت تھی اور ببل گورا چِٹّا.....
یہ کیسے ہوا ـــــ درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے عوض ببل دے گیا ہوگا۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے، بابو جی" ورنہ یہ بل کٹ..... کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔"

"کیوں کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالُم نہیں"، مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے ببل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ـــــ "ہاں عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے"۔

درباری جی کھول کے ہنسا ـــــ "بدمعاش ہے نا..... ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی گود میں اَن گنت گوپیوں والے کنھیا کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں، وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے ببل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے ارد گرد ناچ رہی تھیں....... ببل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ!

درباری نے جو مصری مائی کے ساتھ تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا ـــــ "اس کا باپ کیا کام کرتا ہے، مصری؟"

"اس کا باپ؟" ـــــ مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا ـــــ "نہیں ہے"۔

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھی کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی ـــــ ایک بار وہ پھر آیا تھا..... مجھے یوں ہی لگا، جیسے ـــــ وہی ہے لیکن..... میں کیا کہہ سکتی تھی، بابو جی؟..... میں نے تو اُسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا..... جب تک میں نے اس بچّے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا ـــــ ببل!..... جب سے میں نے اس کا نام ببل رکھ دیا ہے....."

اور مصری پھر سوچنے لگی ــــــ "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا ؟"

درباری سوچنے لگا ــــــ "ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں ...... پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو۔"

درباری نے آج اٹھنی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کے بجائے ببل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ببل نے سکے کو ہاتھ میں لیا۔ زور زور سے بازو کو گھمایا اور پھر اُسے پھینک دیا۔

اٹھنی سڑک پر کے مین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو ایک خشک، بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے اُسے روک لیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنی اُٹھائی اور ببل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی ــــــ "کچا ہے نا ......" اور پھر اُسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی ــــــ "سچ پوچھو، تو میرا مرد یہی ہے۔"

"تیرا مرد ــــــ ؟"

"ہاں۔" مصری نے ببل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی۔ "یہ کماتا ہے اور میں کھاتی ہوں۔"

مصری بہت باتونی تھی وہ اور بھی بہت کچھ کہتی۔ ببل اور بھی کرمرا مانگتا، لیکن درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حُسن اور ببل کی گوری چِٹّی معصومیت کو جھٹک دیا اور ــــــ "میں چلا، صالح بھائی ...... اچھا بھابھی۔" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑے ہوئے دکھائی دیے۔ جنھیں درباری نے جُھک کر باہر نکالا اور سیتا کے پاس جا پہنچا ......

شیلواجی پارک میں، سمندر کے کنارے، کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھارہ اُنیس برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں لچھمن دئی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی،

لیکن شادی سے زیادہ اُسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے "رباب" سے کرایہ اُگاہے تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑیا دکھائی دیتا ہے، بھاگ جائے...... اور جینا سکھی ہو جائے۔ لچھمن دئی سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شک اور وسوسے کا اظہار کرنے لگی۔ لیکن جب اسے پتہ چلا درباری کا پورا نام درباری لال مہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئی میں جو لوگ اُگاہتے ہیں اُنھیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی بے خود سی سیٹی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اس کا پاس آنے ہی سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لیے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔ ہاں سیتا کے بال بہت لمبے تھے۔ جن کے کارن درباری اس سے پوچھا کرتا ــــــ "تمھارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟" اور سیتا کہتی ــــــ "میں خود جو ہوں بنگالن...... میرا نام سیتا موجدار ہے...... درباری کہتا ــــــ "سیتا مزے دار اور سیتا ہنسنے لگتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی روح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دُکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے ــــــ

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے مُنھ کے پاس کرتے ہوئے بولی ــــــ "دیکھو...... میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں؟"

"کیا لائی ہے؟" درباری نے پوچھا اور انجانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔

سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی ــــــ "ایسے نہیں...... میں خود دکھاؤں گی۔"

اور پھر اُسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی ـــــ "سونگھو"۔
شامتِ اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔
محبت کا سارا کھیل رک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی ہنستی جا رہی تھی۔
"یہ" درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا ـــــ "کیا مذاق ہے؟"
سیتا کہنے لگی ـــــ "تم اسے مذاق کہتے ہو؟ ـــــ "بیس روپے تولہ کی نسوار ہے"۔
"نسوار؟"
"ہاں"! سیتا بولی ـــــ "تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو"!
درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی ـــــ "یاد ہے، پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟"
"یاد نہیں"، درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "صرف اتنا ہی پتہ ہے۔ تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا۔"
"وہاں"۔ سیتا نے سامنے، مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور تھیں۔ اس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی اُدھر جا نکلیں ......"
"اُدھر کیوں؟"
"یونہی"۔ سیتا نے کہا ـــــ "چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے، ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کوئی ہونے والا ہے۔ پھر ہوتا ہوتا کچھ نہیں، جبھی پتہ چلا ہے ـــــ کوکا کولا پی رہی ہیں!"
سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"ہم سب تمھاری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیونکہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے فوارے تک اور فوارے سے کنارے تک آ جا رہے تھے اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دُہرے تہرے ہوئے جاتے تھے ـــــ بچے کی طرح میرا جی چاہا، بھاگ کے تمھیں پکڑ لوں اور پلو سے تمھارا مُنہ، تمھاری ناک پونچھوں اور پیچھے ایک چپت لگا کے کہوں ـــــ "اب جاؤ، مزے اُڑاؤ ......"
درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا ـــــ "دوسری لڑکیاں کون تھیں؟"
"ایک تو کمد تھی"۔ سیتا بولی۔ "دوسری جُھلی ...... وہاں کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے

کے پاس رہتی ہے۔ تیسری ـــــ" اور پھر ایکا ایکی رُکتے ہوئے کہنے لگی ـــــ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

ایسے ہی درباری نے جواب دیا۔ "تمھاری سہیلیاں تمھاری جوتی کی بھی ریس نہیں کرتیں۔"

"تم نے دیکھی ہیں؟"

"دیکھی تو نہیں۔"

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھل اُٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پہ پر تولے لیکن رُک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "آج دن ڈوبتا ہی نہیں۔"

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار تیل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خودے لا رہی تھیں پھر بیچ میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے جو دور، اندر، دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے سمندر میں پھینک دیے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل برستے پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصّے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا...... سیتا نے مُڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھپٹ رہے تھے ـــــ

...... دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دُنیا کے دونوں کناروں سے سمیٹے اور انھیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، کیسری رنگ کی گٹھری سی بنا، دور پچھم کے گہرے پانیوں میں اُترنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گُم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان پر کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ـــــ لو اب تمھارا راج ہے۔ جاؤ، موج اُڑاؤ......

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی دار میں اُس کے قریب بھی لے آئی ...... سیتا کانپنے لگی، درباری ہانپنے لگا......

اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پول اور کلب اور سڑک پر کے قمقمے تو ایک طرف، پھیری والوں کے جھابوں اور ٹھیلوں پر ٹمٹمانے والے دیے بھی لرزنے لگے۔

جبھی جیسے دیوار میں سے آواز آئی ـــــ "درباری کیا کرتے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے۔" درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ـــــ "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔"

"پیار کا مطلب ـــــ یہ تھوڑے ہوتا ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں"...... اور درباری اُٹھ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کر کے جانے لگا، سیتا نے اُسے روکنے کی کوشش کی اور التجا آمیز لہجے میں بولی "کیا کر رہے ہو، چاند؟"...... اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی، جو غصے سے ہانپ رہا تھا۔

درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیے اور بولا "Bitch"...... بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے ـــــ"

"میں کچھ نہیں سمجھتی"۔ سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو پکڑتے ہوئے کہا ـــــ "میں تمھاری ہوں، چندا..... نس نس، پور پور تمھاری ہوں۔ پر میں ایک بدھو اماں کی بیٹی ہوں ـــــ مجھ سے شادی کر لو، پھر......"

"کوئی شادی وادی نہیں"۔ درباری بولا۔ "تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟ کیا منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟" اور درباری لال رک گیا جیسے اب بھی اسے امید تھی.......

"ہاں ضروری ہے"۔ سیتا روتے ہوئے بولی۔ "یہ دُنیا میں نے، تم نے نہیں بنائی۔"

درباری کی آخری اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا۔ "میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس کے بیچ کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سویم بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے۔"

"لکھا ہوگا۔" سیتا بولی۔ "سب تمھاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے......"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" درباری نے غصے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا۔ جو ریت میں دھنس گئے اور پھر وہ انھیں کھینچتے، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔

سیتا پیچھے لپکی ـــــ "سنو"...... ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے کو گلے لگا سکتے تھے۔

ایک دو لڑکے فضا میں تعجب سے دیکھ کر رُک گئے۔ پھر چیخنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی ـــــ

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑ لیے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر رکھ دیں اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی، درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی، ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اُٹھ کر درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "تم سمجھتے ہو، میں کسی برف یا کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھُل مل جانے کو جی نہیں چاہتا، تم مجھ سے لگتے ہو تو میرا انگ انگ ٹوٹنے، دُکھنے نہیں لگتا؟...... پر تم کیا جانو، ایک لڑکی کے دکھ......"

اور پھر کسی انجانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی۔ "میں یہ نہیں کہتی یہ دکھ تم نے دیے ہیں یا بھگوان نے دیے ہیں۔ بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے......"

"میں سب جانتا ہوں" درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مرد سب سہہ سکتا ہے، توہین نہیں سہہ سکتا۔"

"کس کی توہین؟"

درباری نے جواب دینے کے بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری۔ خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا ـــــ

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی چھاتی میں منھ چھپا کر وہ سب بھول گئی تھی جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پہ ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دُکھ دور ہو گئے تھے......

وہیں ریت پر پڑی سیتا دبی دبی سسکیاں لیتی رہی۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لیے تو نہیں آ رہا جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لیے کوئی نہ کوئی بانکا ضرور چلا آتا ہے...... یہ سامنے دیے کی لَو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب ـــــ اس میں ریت چلی آئی تھی......

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار کرتا تھا، لیکن اتنا نہیں جتنا سیتا کرتی تھی۔ سیتا تو جیسے اس دُنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لیے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کوئی اوپر سے سندیسے میں انگوٹھی پھینکے...... لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک بیچ میں کیا کچھ ہو گیا تھا، اب تو انگریزی "فن" چلا آیا تھا، جس سے درباری پورا لطف اُٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا، صاف سُتھرے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، درباری خالی خولی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاسنی اور کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھانجا محمود یا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بدوضع کھلونے سے کھیل رہا تھا جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لیے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا، بچہ رونے مچلنے لگا۔

"ہے ہے......" درباری نے احتجاج کیا، "کیا کر رہی ہو آپا؟"

"تم چُپ رہو جی!" وہ بولی۔ "تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو...... دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟"

"اچھا جی"، درباری بولا۔ "اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا ہے...... ایسے تو لارڈ کچنر بھی پورا بیڑہ ڈوب جانے پر نہیں رویا ہوگا.... دو اسے کھلونا"

"کیسے دوں؟..... کہیں آنکھ پھوڑ لے ——"

"سب بچے اُلٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟"

"جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟"

"سب ماؤں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے۔"

اور محمود یا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلّی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنا اور قلابازیاں لگانا شروع کر دیتی تھی جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی محظوظ ہونے لگتے تھے۔ لیکن بچوں کو تو وہی کھلونا چاہیے جو کسی نے چھینا ہے...... درباری نے بڑے بڑے مُنھ بنائے، کیسے کیسے

خوخو، خاخا کیا، منہ میں انگلی ڈال کر ہنومان بنا، پھر جاتی واکر، آغا.... لیکن وہ رو رہا تھا، اُسے اپنا وہی کھلونا چاہیے تھا۔ درباری کا جی چاہا، اسے تھپڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلا کر کہا۔ "اب بند بھی کر، سالے..."

اندر سے آواز آئی ...... "رونے دے یار۔"

بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، اُلٹے پیروں —— "ہے رام!

"ہائے اللہ کیوں نہیں کہتیں؟"

"بھگوان کے لیے تم چپ رہو۔"

"خدا کے لیے کہو تو......"

پھر ستونتی یا کنیز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی —— "لے میرے باپ"۔ اس کھلونے کو بچے کے ہاتھ میں ٹھونستے ہوئے کہا اور پھر جیسے اس کی حالت زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، ہلورے دیے، قمیص سے اُس کا منہ پونچھا۔ ناک صاف کی۔ چوما، چاٹا.......... اور اس کے کہے کے مطابق بڑی ٹھنڈ پڑی........

پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں۔ "ہائے، مرجائے ایسی ماں........ نہ رہے اس دُنیا میں، لال کو کتنا رُلایا ہے۔"

اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی۔ "دیکھو تو کیا مزے سے بیٹھے ہیں۔"

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ..... خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے۔

درباری بولا "اب چاہے ہاتھ نہیں، گردن بھی کاٹ لے۔"

"کاٹ لے۔" دیدی بولی۔ "مروں گی میں ...... تم لوگوں کو اتنا سا بھی وہ نہ ہوگا۔"

"ہوگا یا نہیں۔" درباری بولا۔ "کہتے ہیں نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا کرتا ہے۔

لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد...... پہلے ہی چھیننے کی بے وقوفی نہ کی ہوتی۔"

"ہاں، میں بیوقوف ہوں۔" دیدی کہتی ہوئی بچے کو اندر لے گئی۔ "ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا الگ باتیں ہیں۔"

اور دیدی کے کاندھے پر سر رکھے بدمعاش محمود یا بنواری ہنستا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے اپنی طاقت اور قدرت کو اچھی طرح جانتا ہو۔

جبھی سامنے اوڈرا سنیما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سارنگ دو تین بار لہرایا۔ درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کیے۔ سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا ——— موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک بار درباری کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔

کہیے حضور ...... کیا حکم ہے؟" درباری نے پوچھا۔

سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو، درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا۔" اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر......" اور وہ لوٹنے لگا۔

"سنو" سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی ——— "مجھے چھما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔"

درباری نے رک کر اس کی طرف دیکھا ——— "اب تو نہیں ہو گی؟"

سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟"

سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منھ پرے کرتی ہوئی ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھردرے سے ہاتھ پھیلائے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا ——— "تو تو ایسے ڈر رہی ہے سیتے!.... تجھے دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں بڑا نیچ ہوں!"

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی بولی ——— "نہیں .... ایسا کیوں؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیواجی پارک میں، دیوار کے نیچے .... دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر منعکس ہونے والی روشنی کو ادھر زمین پر پھینک دے، اس لیے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپیٹ لیا، سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کے ارد گرد بنے ہوئے جنگلے، خاکے بنے اور پھر معدوم ہو گئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے، سیتا منفعل سی بیٹھی رہی، درباری ایک دم جھلا اٹھا اور بولا ——— "کچھ ہنسو بولو بھی نا ——— سیتا کو ہنسنا پڑا۔

درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی ....

درباری حوصلہ پا کر بولا —— "تمھیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواش نہیں ؟"

"یہ بات نہیں"۔ سیتا بولی۔ "تم مجھ سے شادی کر بھی لوگے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھوگے۔ سمجھوگے، میں ایسی ہی تھی ......"

"نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا .... کبھی نہیں سمجھوں گا۔"

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لیے چلے آئے۔ درباری چونکا' اس کی تسلی ہوئی جب انھوں نے سلاخیں بریتے میں مارنی شروع کر دیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے۔ جو دو ایک دن پہلے انھوں نے بریتے میں دبایا ہوگا اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اوپر بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی، لجا رہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے "اے مرے دل کہیں ......" گاتے ہوئے پاس سے گزرے پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری جھلا کر اٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے ارد گرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی' اور بولا —— چلو سیتے جوہو چلیں گے۔"

"جوہو ؟ ....."

"ہاں —— اٹھو کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔"

سیتا چپ چاپ اٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ میں اِدھر اُدھر پھر نہ سکتے تھے۔ کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا۔ چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو بھر زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔

لیکن اس دن جوہو کے سب ہوٹل، سب کاٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔

راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا بے تعلق، زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منھ میں رکھ لی ہو جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تاڑدیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی روڈ پر جا پہنچی جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔

ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا —— "کوئی کمرہ ہے؟"

منیجر نے غور سے درباری کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کرکے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی ہوئی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ جبھی منیجر نے پوچھا —— "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"جی؟" درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا۔ "اورنگ آباد سے۔"

"خوب!" منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"جی سامان تو نہیں ہے۔"

"معاف کیجیے۔" منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نجس اور لجلجی شے ہو اور بولا —— "اپنے پاس کوئی روم نہیں۔"

"کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلی فون پر ——؟"

بیرہ نمبر ۲۷ جو ایک ٹرے پر ویفر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لے کر جا رہا تھا، بول پڑا —— "یہ ہوٹل عزت والے لوگوں کے لیے ہے، صاحب!"

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیرے کا ٹِپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ منیجر صاحب کی عزت پانچ روپے سے ..... اور آج یہ سب کے سب ایک دم نیکی اور عزت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے۔ وہ عزت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی گزرنے کے لیے مشّاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور

بے حیائی لانی پڑتی ہے۔ جس کے سامنے مدِ مقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے...... درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا — وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا —

لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں، جنھیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سُنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی۔

"چلو میتا۔" درباری نے کہا۔ "پھر کبھی سہی۔"

اور دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیے........

زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہو گئے اور بہت سے ہیرو پیروں میں آگرے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ یہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ...... یا تو پیدا ہی نہ ہوتی۔ اسی لیے بڑے خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی اولاد کی طرح انھیں جھٹک نہیں سکتے، ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیونکہ ہر دو صورتوں میں سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آلیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، بالکل بے دست و پا — غسل دی جانے والی میت کی طرح —

درباری اس وقت برآمدے میں بیٹھا ہوا ڈان باسکو کی دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن کی چھاؤں میں محلے کی امراء کی موٹریں سستا رہی تھیں۔ کچھ تو یہ اُن امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے اُن کی پوری تسلی ہو جاتی تھی۔ اور کچھ ایسے لوگوں کی جنھوں نے انھیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا تھا۔ اُن کے ڈرائیور دن

کو سرشام گاڑی چمکانے اور منھ سی رکھنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی۔ یہ بیرہ نمبر ۲۸ تھے۔

درباری نے کھینچ کھانچ کر اس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی، کا، کاربیں افزائش پانے والی امید سے تعلق پیدا کرلیا۔ لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے؟ باپ گردھاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے۔ اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا۔

صالح بھائی، یا سرداری لال مع اپنے بیوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پیچھے ٹھنٹ سے بازوؤں والی بے بچہ بھابی رہ گئی تھی جس کی بھیّا سے بچہ نہ ہونے پر تکرار ہی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی تم میں نقص ہے، اور وہ کہتے تم میں۔ وہ کہتی تم ڈاکٹر کو دکھاؤ، وہ کہتے تم اپنا معائنہ کراؤ۔ اور ناپید بچے مایوسی سے انھیں دیکھتے رہتے اور اپنا سر پیٹ لیتے ——

درباری مکمل طور پر بور ہوچکا تھا۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، کچھ دن تو زندگی دیکھ لے۔ آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے ——

کس کے ساتھ شادی؟ سیتا ایک کر اس کے دماغ میں آتی تھی۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی، لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں۔ وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی، شکل وصورت سے بھی بری نہ تھی، لیکن بیوی —— بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہیے۔ اِدھر اُدھر جھانکنا چاہیے تاکہ مرد کان پکڑ کر کہے: "اِدھر" اور پھر بدھوا کی بیٹی مرد سے یوں چمٹتی ہے جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔

—— میں کہاں کرائے اُگاہتا پھروں گا؟

ہاں تھوڑی دیر کے پیار کے لیے سیتا سے اچھی کوئی نہیں۔ کیا جسم پایا ہے!

جبھی مصری دکھائی دی اور ببل دکھائی دیا......

مصری دور ہی سے "بابوجی" کی طرف انگلی کرتی ہوئی آرہی تھی اور ببل وہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا ہمک رہا تھا۔ پھر یکایک ببل میں زندگی اُچھلی جیسے گیند زمین پر سے اُچھلتا ہے۔ اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

آج ببل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ ایک میلی سی بنیان پہن رکھی

تھی۔ ہاں، پیچھے اللہ ہی اللہ تھا۔

پاس آتے ہی ببل نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ——"کینہ! جیسے میں اس کے لیے کرمرا لیے ہی تو کھڑا ہوں" —— جیسے اندر جانا اور باہر آکر اس کے حضور میں باج گذاری اس کے صبر کی آخری حد ہے۔

درباری کرمرا لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا —— مصری ایک عورت ہے اور ببل اس کا بچہ۔ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر محض تکلف کی چیز۔

جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آجاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرمرا ببل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا بات تھی جو آج درباری ببل کو گود میں نہیں لے رہا تھا۔ جیسے وہ شرما رہا تھا، لیکن وہ ربڑ کی گیند —— ببل —— جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اُسے کرمرا نہیں چاہیے تھا۔ اسے کرمرا بھی چاہیے تھا اور آسمان کی بادشاہت بھی۔ ببل حیران ہو رہا تھا —— آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

"آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصری؟" درباری نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی چودہ آنے۔"

"کیوں؟ صرف چودہ آنے کیوں؟"

"آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا۔" مصری نے بے باکی سے کہا۔

"تیرا مرد؟" درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے کوئی مرد کر لیا ہے؟"

مصری ہنسی اور ببل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی —— "یہ ہے میرا مرد، میرا اکماؤ مرد،........ اسے آج اس کی موسی پارلے کی چونا بھٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان دی جو یہ ہل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا۔"

درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ ببل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور ببل کرمرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا۔

مصری بولی "ننگا رہنے کی عادت پڑ گئی تو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ مصری"

ببّل جیسے ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا ـــــ جھوٹ!...... اچھا لگتا ہوں تو پھر مجھے لیتے کیوں نہیں؟" اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا ـــ "ہو، ہو، ہو......"

"ببّل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو؟" درباری نے پوچھا۔

"یہ؟" مصری ببّل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے "یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی ـــــ"

درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا ـــــ

"یہ کیا بابو جی؟" وہ بولی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

"تم لو نا" درباری بولا۔ اور پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا "جلدی سے لے لو نہیں کوئی دیکھ لے گا"

مصری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب تک اُس کا چہرہ قرمزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے نیفے میں اڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جو اب وہ سال میں مشکل سے تین چار بار سُنتی تھی۔ لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اُس نے درباری کی بات سُنی ـــــ

"تم جانتی ہو مصری" درباری بولا۔ "میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں...... ببّل سے ...... اگر تم اسے ایک دن کے لیے مجھے دے دو ـــــ"

مصری کچھ نہ سمجھی ......

درباری نے کہا ـــــ "میں اسے کلیجے سے لگا کے رکھوں گا، مصری ـــــ ایک ماں کی طرح۔ یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے، اتنا اچھا لگتا ہے کہ ـــــ بہت ہی اچھا لگتا ہے"۔ اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر ببّل کو لے لیا۔

ببّل ایک دم خوشی سے اُچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ گُرمروں کے لیے گردن کو یوں اِدھر اُدھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو ہلاتا گھماتا ہے۔ ...... پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائیکل کی طرح چلنے لگے، درباری نے کرمرے کے کچھ دانے ببّل کے منہ میں ڈالے جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا

تھا، لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اُتار دو، کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو ـــــــ بیچ میں اُس نے ماں کی طرف دیکھا، ہنسا بھی لیکن مُنہ درباری کی طرف کر لیا، ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔

مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کہیں آپ کے کپڑے خراب کر دیے تو؟"

"تو کیا ہوا؟" درباری نے کہا۔ "بچّوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔"

مصری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا۔ زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کے لیے اسے مرد مل گیا۔ اب اس نے سوچا، میرے بچّے کا باپ مل گیا اور پہلی چیز سے دوسری بہت بڑی تھی۔

"میں اسے کھلاؤں گا، پلاؤں گا، مصری۔" درباری نے وعدہ کیا۔ "تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا۔"

"اچھا ـــــــ" مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی، پھر رُک گئی۔ مُڑ کر بچّے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا اور اپنے اِرد گِرد درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کے نہ کھُلنے پر جھلّا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی، ببّل نے دیکھا بھی۔ مگر اُسے آج کسی بات کی پروا نہ تھی۔ باپ کی پروا نہ تھی تو ماں کی بھی۔

مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی اور جب اُسے اس بات کی تسلّی ہو گئی کہ ببّل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اُس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

درباری ببّل کو لیے اندر آیا۔ ببّل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہر چیز اس کے لیے نئی تھی۔ ہر شے کو وہ منہ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچّے کو دیکھ کر حیران ہو اُٹھی۔ ناک پر اُنگلی رکھتی ہوئی بولی "ہائے رام، یہ کیا؟"

"ببّل، ماں! ـــــــ مصری کا بیٹا۔" درباری بولا ـــــــ "مجھے بڑا پیار لگتا ہے۔"

"اس کی ماں کہاں ہے ؟"

"گئی .... میں نے تھوڑی دیر کو لے لیا ہے' اُدھار..... ایک بار پیدا کر دیا' پھر ماں کا کیا کام ؟" درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——

"جا رے جا" ماں بولی "چھ آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے۔ پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں"

"اچھا ماں" درباری نے کہا "میں اسے پودار کالج کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگموہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں۔ تو ذرا اسے پکڑ"

ماں نے جُھرجھری لی "ہا —— گندا" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاتی"

بھابی جو کچھ دیر کے لیے اکھڑی ہوئی تھی' بولی "اتنا ہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے ؟ شادی کر لیتے ؟"

"نہیں" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا —— "مجھے دوسروں ہی کے اچھے لگتے ہیں"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی —— "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے ؟"

درباری نے ببّل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببّل چمچے کو منہ ڈالتا اور چوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت رہا تھا۔

ایکا ایکی ببّل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں پھر بھابی کی طرف پھیلا دیے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر جیسے اندر کے کسی اُبال نے اُسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببّل کو اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر ہلنے لگی، جیسے کسی اپار سکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببّل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببّل کو نہلا دُھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سینکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بنا ڈالے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اسے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی ——

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اوپر

کچھ کتابیں۔ پھر دھپ سے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی طرف اُمڈا۔

بیٹھک میں پہنچا تو ببّل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سر دیئے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اُس نے منہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل، جانے کس جذبے، کس گنتی سے اس نے اپنے پوروں پر درباری کی طرف پھیلا دیے۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببّل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور "اچھا بھابی"...... کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان سے درباری نے ببّل کے لیے ایک قمیص خریدی اور ساتھ ایک نیکر بھی۔ قمیص تو جیسے تیسے ببّل نے پہن لی، لیکن نیکر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلاّنا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا۔ ابھی ہمکا، پھر گرا، درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر منہ اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو —— عجیب آدمی ہو ایک بچّہ بھی پکڑنا نہیں آتا۔

پھر ایکا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اوپر کی طرف ہمکا۔ بجلی کے ڈر سے درباری نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ ببّل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی، دوکان دار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا، نہیں تو جناب کی انگلی اُڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اُٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور پھر دوکان دار کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی طرف ہاتھ اُٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو —— اس نے مجھے مارا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببّل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نیکر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی، وہ "زندگی بھر" یوں کسا نہ گیا تھا۔ درباری نے اُسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلے کی طرح اکڑ گیا، جیسے کہہ رہا ہو —— تم گاڑی پر بیٹھو۔ میں تم پر بیٹھوں گا نہیں مجھے لے کر چلو —— بازار میں جہاں لوگ آجا رہے تھے۔ پھر اس نے زور سے اوپر نیچے ہو کر آخر نیکر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چرمُر کر دیا کہ

کوئی استری اُس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی اور اب ــــ نیکر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دُنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا!

درباری جب سیتا کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھا دیوی میں کمد سے ملنے گئی ہے۔ پربھا دیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمد کے گھر کا کیسے پتہ چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی ــــ کیوں کیا کام ہے؟ اس لیے خاموش ہی رہنا اچھا تھا۔

اس پر ایک اور مصیبت ــــ ماں بتانے لگی، پہلے مالے پر رہنے والے سندھی نے "نوسٹ" دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی بوڑھی باتیں سُنتا رہا اور بتاتا رہا یہ تبل اس کا بھانجا ہے، بڑا پیارا دُلارا بچہ ہے لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا، "کیوں رے؟" تبل نے جواب بھی دیا لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔ تبل کو ماں کی بولی معلوم تھی۔ لیکن ماں تبل کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے بیٹھی ــــ "کمیٹی کہتی ہے، ہر سال اتنے پیسے مرمت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کروائے۔ کیا کیا کانون پاس ہو گئے رہیں۔ کانگریس سرکار تو ڈوبنے کو آئی ہے۔ انسٹ گر ہی میں کیا ہوگا؟ میں تو جگادھری مائیکے لوٹ جاتی ہوں ...... تم شادی کب کروگے؟"

کوئی ہی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں۔ ماں بور ہو گئی۔ بولی ــــ "سیتا پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہی ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔"

"میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی ــــ"

"کدھر جا رہے ہو؟"

"شہر کی طرف۔"

"ٹھیک ہے۔" ماں بولی۔ "وہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے ...... ہنڈولے آ رہے ہیں نا مجھے مولی خریدنی ہے۔ مولی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟"

درباری سٹپٹا کر رہ گیا۔ تبل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا ــــ "چلو ماں جی، میں آپ کو

پہ ریل چھوڑ دوں راستے میں کمد کا گھر ہے نا ؟"

"ہے تو" ماں اُٹھتے ہوئے بولی ___ "پر آگ لگے ___ یہ بازار بمبئی کے .....
بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی ___"

"چلو اکیسویں بار بھی بھول جانا"

"پر تم سیتا کو لے کہاں جا رہے ہو ؟"

"دیدی کے پاس ...... کھانا"

"سُنا ہے وہ مسلمان ہے ؟"

"کیا بات کرتی ہیں، ماں جی ؟" درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو تھام لیا ___
ستونتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے ؟"

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر مسلّط ہو جائے، سیتا چلی آئی بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لیے۔ اس نے آئرن۔ گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بیگمی چادوں کے کلر کی سی ہینڈ لوم لپیٹ رکھی تھی جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کے لیے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول کے پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اُڑنے لگے ..... اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر آپس میں ٹکرانے، دل کو ہڑکانے لگے ___

سیتا نے آتے ہی پہلے ببل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں ___ "کس کا بچہ ہے ؟"
اور پھر لپک کر بچے کے پاس پہنچی "ہے کتنا پیارا ہے، ببلو سا"

"ہاں" درباری نے کہا "ببل ہی اس کا نام ہے۔ تمھیں کیسے پتہ چلا ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" سیتا نے تالی بجاتے ببل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا ___
"ہر بچے کی شکل سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے ..... تمھیں نہیں چلتا ؟"

ببل نے پہلے شک و شبہہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اُٹھا دیے۔ سیتا نے اُسے اُٹھایا چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور "او ..... او ....." کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو،

اس میں کچھ ہے، میرے لیے ؟

درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سیجیں تھیں اور بچے۔ شاید ببّل سیتا کی آنکھوں میں سے منعکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اتاولے ہو کر کہا ــــ "گھنٹہ بھر سے میں تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں، دیدی نے بلوایا ہے"۔

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا ــــ "ماں ــــ ؟"

"ہاں بیٹا"..... ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر..... میں اس کے لیے کچھ بسکٹ ......"

درباری نے اور بے صبری سے کہا ــــ "ہوتے رہیں گے، تم چلو...... میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے"..... اور سیتا ببّل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئی۔

"اے تو تو تھوتا سا موتا سا، گوتا سا ببلو ہے......"

اور سیتا دل میں اتنا سا بھی وسوسہ لیے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی ــــ "اس میں چلیں گے ؟"

درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببّل اور سیتا اور آخر میں درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی ...... ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گذری۔ "یہ سوٹ کیس ــــ ؟"

"ہاں"۔ درباری نے کہا۔

"دیدی کے ہاں جا رہے ہو ؟"

"کہیں بھی جا رہا ہوں، تمھیں اس سے کیا" اور پھر خشم ناک نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا ــــ "تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے جاؤں گی"۔

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس ..... بچہ ...... اس نے ڈر کے عالم میں ببّل کو سیٹ پر بٹھا دیا اور نتھنے پھیلاتی ہوئی بولی۔

"ہاں، کہا تھا ــــ"

سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرا لیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلّو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے

خمار آلود نگاہیں سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا ——— "سیتا! تم پھر لگی ہو اس دن کی طرح کرنے۔"

سیتا ڈر گئی ——— "نہیں تو" وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی۔ آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مانسون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا کچیلا، گندہ اور گیلا ...... شاید دور کہیں برسات شروع ہو چکی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑ رہی تھیں ......

پھر وہی سفر ——— تارڈیو، اوپرا ہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین ——— اور ایک ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ اس دن گئے تھے۔

سامنے ایک بیرہ کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزت، بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اُترا، ٹیکسی والے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اُتارنے کا اشارہ کیا.... سیتا اُتری۔ اُس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اُسے کچھ تامل ہو رہا تھا ———

"اٹھاؤ نا" درباری نے ببل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بچہ ہمیشہ عورت اٹھاتی ہے"

سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببل کی طرف دیکھا جیسے وہ ابھی اُسے اٹھانا نہ چاہتی تھی لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اُس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببل کو اٹھا تو لیا لیکن اُسے پیار نہ کر سکتی تھی...... اسے کچے کچے، کھٹے کھٹے، گندے گندے ڈکار سے آنے لگے تھے۔

ہوٹل اوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا ——— کمرہ ہے؟..... اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔

سیتا نے دیکھا ——— سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھی کے ڈرم لڑھکا دیے ہیں۔ مدرسہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے، ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ ہو رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دینی کی آواز آ رہی تھی۔

رستے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

مینیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک

چلی آئی ۔ وہ عجلت سے کونٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا ..... "ویلکم سر..... آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے ۔

درباری نے منیجر سے کہا ___ ہم بلی مورا سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں ۔ گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے، جہاں تاج محل دیکھیں گے جو شاہجہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لیئے بنوایا تھا ۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جرم کا احساس تھا ۔ کیونکہ اس سے اس نے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کیے تھے ۔ اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا....." پر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ منیجر سر، سر" کرتا رہا ۔ ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا...... سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجالاتا ۔

رجسٹر پر دستخط کرنے پر درباری کمرے میں پہنچا تو ببل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے ۔

"یہ کس نے دیے ؟"

"بیرے نے" سیتا بولی ۔

"اور یہ ___ آئس کریم کی کون ؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے"

اور بیرہ بچے کے لیے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا...... جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا ۔ اور آج اُسے ایکا ایکی کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی ۔ جس کے سامنے ٹپس کی آمدنی اور بیگار کوئی معانی نہ رکھتے تھے ۔ وہ خوش اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ یوں کھڑا تھا جیسے وہ کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے ۔ وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا ___

"اچھا بیرہ" درباری نے بیرحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا ___ "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو نا کب سے چلے ہیں ۔ اب تھوڑا آرام کریں گے ۔"

"جی ۔" بیرا بولا " میر جرورت پڑے صاحب......"

درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی ۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا ۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جاکر بستر پر بیٹھ گیا ۔ اسے سیتا کا ببل کو دودھ

پلانا بُرا لگ رہا تھا، لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ کہتا تو بُرا لگتا، بہت ہی بُرا ___ جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببّل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا ___ "بات! گندا کہیں کا۔" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے اور پھر جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی۔ ببّل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ ہوٹل اتنا اچھا نہیں۔" وہ یونہی سی بات کرنے کے لیے بولا۔

"ٹھیک ہے۔" سیتا بے پروائی سے بولی۔

پھر درباری ناک سکوڑ کر اِدھر اُدھر سونگھا اور کہنے لگا ___ "کوئی بو سی آ رہی ہے...... اور پھر اس نے پسینے کے قطرے اپنے ماتھے سے پونچھ ڈالے اور بولا ___ "تم اب اُسے چھوڑو بھی۔"

سیتا نے ببّل کو بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلا ہو گیا۔

درباری نے ایک ایش ٹرے ببّل کے پاس لا رکھی اور ببّل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا...... وہ کیا کرتا؟

پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے، بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھگوان کے لیے"...... سیتا بولی، اور اس نے ببّل کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن درباری کی آنکھوں میں جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ نہ دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک نرو تازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں گُھبے جا رہے تھے۔ سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوتی جا رہی تھی...... آج خود بھی وہ بے سہارا ہو جانا چاہتی تھی......

ببّل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا ___ "وہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔"

"میں تم سے پیار نہیں کرتی؟......میں تم سے......"

ببّل نے ایش ٹرے کی راکھ مُنھ پر مل لی تھی اور رونے لگا تھا!

"چپ بے" درباری نے نفرت اور غصّے کے ساتھ کہا۔

سیتا چونکی، وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن ـــــ اس کے ہاتھ باز و جواب دے چکے تھے......

درباری کی ڈانٹ کے بعد ببّل نے ڈکر چلاّنا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو کر لپکا جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ ببّل کے پاس پہونچتے ہی اُس نے زور سے ایک تھپڑ ببّل کو مار دیا۔ ببّل لڑھک کر دور جا گرا۔

"شرم نہیں آتی؟" کہیں سے مصری کی آواز آئی۔

درباری نے پلٹ کر دیکھا ـــــ مصری نہیں سیتا تھی جو کسی ان جانی طاقت کے آجانے سے نیم برہنہ حالت میں اُٹھ کر ببّل کے پاس چلی آئی تھی اور اُسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ ببّل سیتا کی چھاتیوں میں سر دیے رو رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منھ اُٹھایا، اور بندھی ہوئی گھگھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو ـــــ اس نے مجھے مارا!

درباری کو محسوس ہوا جیسے اتنے صاف سُتھرے کپڑوں میں بھی وہ گندہ ہے۔ وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا جتنا ببّل سے...... لیکن اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اُٹھایا اور ببّل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نیم برہنہ تھی اور ببّل سے اپنے آپ کو چھپا رہی تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دُنیا کا سفلہ ترین انسان تھا جو اس کمینہ حد تک اُتر آیا تھا...... پھر اُس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی سمجھ نہیں رہی تھی۔

شرمساری، ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ ببّل کی طرف بڑھایا۔ سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی ببّل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ ببّل خود ہی بے تاب ہو کر درباری کے بازوؤں میں لپک گیا اور روتے ہوئے اُلٹا

سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ اس نے مجھے مارا...... اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس ـــــ

"سیتا!" درباری نے کہا۔

سیتا کچھ نہ بولی۔ وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلّو کھینچا۔ اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"سیتا" درباری پھر بولا ـــــ "تم کبھی مجھے معاف کر سکوگی؟" اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "ہم پہلے شادی کریں گے"۔

اور پھر اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔ سیتا نے درباری کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ درباری سے لپٹ گئی اور اُس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچّوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں درباری کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ دونوں کے دُکھ ایک ہو گئے اور سُکھ بھی........

ان دونوں کو روتے دیکھ کر ببّل نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی درباری کی طرف دیکھنے لگا...... جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے کرمے کے لیے درباری کی مٹھی کھولنی شروع کر دی......!

سعادت حسن منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں اُنھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں اُنھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہرحال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرّر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دئے گئے تھے۔ جو باقی تھے اُن کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بورڈر پر پہنچا دیے گئے تھے۔

اُدھر کا حال معلوم نہیں لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دل چسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان جو بارہ ۱۲ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمیندار' پڑھتا تھا۔ اس سے جب اُس کے دوست نے پوچھا ——— "مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے بڑے غور و فکر کے ساتھ جواب دیا ——— "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں اُسترے بنتے ہیں"۔

یہ جواب سُن کر اُس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا ——— "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ——— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی"۔

دوسرا مُسکرایا ——— "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ——— ہندوستانی

بڑے شیطانی اکڑ اکڑ کر پھرتے ہیں۔"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے۔ اس کا محلّ وقوع کیا ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا ـــــ اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان اور ہندوستان کے چکّر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا۔ جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اُسے نیچے اُترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا ـــــ "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دَورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اُترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی، پاس ریڈیو انجینیر، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلک باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی

کہ اس نے تمام کپڑے اُتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا۔ یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے، مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سُنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اُسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا، جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے —— اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل بُرا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو اُن کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یہ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سُننے میں آتے تھے "او پڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین"۔ دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اُس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا ____ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سُنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا ____

اوپڑدی گڑگڑدی بے دھیانادی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ،،

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ آف دی ٹوبہ ٹیک گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس اُلجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سُنا ہے پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے۔ اور یہ بھی کون سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے سر اور داڑھی کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ اُلٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اُسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اُسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اُسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل

لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی، اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینہ ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی وہ اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بہ دن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اُسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں پر اب جیسے اُس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اُسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا —— "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں، اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اُسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر اُس پر برس پڑا —— "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گورجی دا خالصہ اینڈ واہے گورجی کی فتح —— جو بولے سو نہال، ست سری اکال!"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔ تبادلہ سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا،

ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اُسے روکا ——— "یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمھارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور بڑ بڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ——— "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں، لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا ——— "بیٹی روپ کور۔"

فضل دین نے رک رک کر کہا ——— "ہاں ...... وہ ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا ——— "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سُنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ——— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کور سے بھی۔ بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا کہ فضل دین راضی خوشی ہے ——— دو بھوری بھینسیں، جو وہ چھوڑ گئے ہیں، اُن میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ...... اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا۔ میں ہر وقت تیار ہوں ...... اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا ——— "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا ——— "کہاں ہے! ——— وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا ——— "پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ...... نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ——— "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے مُنہ۔"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے

پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈ پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور اُن کے دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ وہ اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے، جو ننگے تھے اُن کو کپڑے پہنائے جاتے، تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے، کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُنھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سُن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا ـــــ "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ـــــ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا ـــــ "پاکستان میں۔"

یہ سُن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اُس نے چلنے سے انکار کر دیا ـــــ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے!" اور زور سے چلانے لگا ـــــ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی آن ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان!"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو فوراً اُسے وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف

لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اب اُسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی —— اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے مُنھ لیٹا ہوا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

سعادت حسن منٹو

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اُس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا ــــــ وہ رات یہیں ٹھہرتا پر اُسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اُس داروغے سے وصول کیے تھے، اُس کی چُست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو اُبھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اُتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکّے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اُس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھُل مل جاتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ اِن سکّوں کی چاندی پگھل کر اُس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔!

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھیا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور کچھ اُس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر ختم کیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اُس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کے اُس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو رات اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو گیا ہو۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نُچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے ہوئے چپل اُس کے پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک

خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اُڑے ہوئے تھے، دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو یہ معلوم ہوتا کہ پیر پونچھنے والا پُرانا ٹاٹ دوہرا کرکے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف سے چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا، گالوں پر لگانے کی سُرخی، ہونٹوں کی سُرخ بتی، پاوڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ جو گردن کو اپنی پیٹھ میں چھپائے سو رہا تھا، پنجرہ امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا کوئی اور جانور اُڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت پر سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا، اس پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بُری حالت تھی گراموفون کی زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا اِدھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی، بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو کہ تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اُتار کر فریم جڑائی گئی ہے۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا۔ تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو کہ دیے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لو ہوا بند ہونے کے ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دُور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے

تھے، البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونا سے چھٹی لے کر آتا تھا تو اُسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اُس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اُس نے خاص اسی کام کی غرض سے کھدوایا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلّال نے بتایا تھا۔ اُس نے جب یہ سُنا تھا کہ مادھو پونا سے آکر سوگندھی پر دھاوے بول دیتا ہے تو کہا تھا ——— "اِس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ——— سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور دو چار روز ٹھہر کر تیرے ساتھ مزے اُڑاتا رہتا ہے۔ بلکہ تجھ ہی سے کچھ لے مرتا ہے ——— سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اُس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ——— سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں، میں تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلّال نے جو بمبے شہر کے مختلف حصّوں سے سو روپے سے لے کر دس روپے تک والی ایک سو ایک چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا۔ "سالی، اپنا دھن یوں برباد نہ کر ——— تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر ——— لے جائے گا وہ تیری ماں کا یار! ——— اِس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر ——— 'تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک ادھیلے کا مُنہ نہیں دیکھا، باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا، بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں' ——— سمجھیں؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس سے کہا تھا۔ "نیچے سے ان بمبوں کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اِن کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سُن کر ہنس دی تھی۔ "جمنا تو سب کو اپنی طرح سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تُو تو سمجھتی ہے کہ باقی سب کے ساتھ بھی ایسا ہی

ہوتا ہو گا ___ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ! ___ ارے ہاں۔ کل کی بات تجھے سناؤں، رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا ___ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ___ ارے! وہ تو ڈرنے لگا! ___ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا! ___ وہ سہم سا گیا! میں نے کہا، 'چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا' ___ بولا۔ روشنی کرو ___ روشنی کرو ___ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا؟ ___ بولا۔ 'لائٹ ___ لائٹ!' ___ اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "کبھی میں تو لائٹ نہ کروں گی" ___ اور یہ کہ میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ___ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا ___ "تجھے شرم نہیں آتی مردوئے!" ___ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی! ___ وہ پھر گھبرانے لگا ___ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی۔ کبھی اندھیرا! کبھی اجالا! کبھی اجالا، کبھی اندھیرا! ___ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا ___ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا ___ جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لئے۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بھی بتائے تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی ___ "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اس سے خوب شرارتیں کرو۔ ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو۔ ستاؤ۔ اس کے گدگدی کرو۔ اس سے کھیلو ___ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ___ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ___ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی ___ ایسے مرد کو کہ چپ چاپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں ___ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ وہ خود ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ وہ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے

اُس کے دماغ سے پھسل کر اُس کے پیٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث لکیریں پڑ گئی تھیں ! —— ان لکیروں کو پہلی بار دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اُس کے خارش زدہ کتّے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیے ہیں —— جب کوئی کُتیا بڑی بے اعتنائی سے اُس کے پالتو کتّے کے پاس سے گزر جاتی تھی، تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا!

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات —— کوئی کومل بول —— اُس سے کہتا تو وہ جھٹ پگھل کر اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اُس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اُس کے بہت بُری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے —— ایسی تھکن جو اُنھیں جھنجھوڑ کر —— اُنہیں مار کر سُلانے پر مجبور کر دے!

—— ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے کتنی مزیدار ہوتی ہے —— وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے کتنا آنند دیتی ہے! —— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو! اور اسی ہونے نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوتی ہو۔ اوپر ہوا۔ نیچے ہوا۔ دائیں ہوا۔ بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا۔ اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص لطف دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اُس میں چھپ جایا کرتی تھی۔ تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اُس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ وہ اپنی ساری زندگی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں اور کبھی کبھی اُس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو کہ وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی! —— کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اُسے ڈھونڈھ لیتا تھا —— بس یوں ہی اُس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اُس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اُس کے چوڑے

ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو بے شمار گرہ مردوں کو ٹھیک کرنے کے لئے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ اِن مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اُس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی! میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" ——— اور سوگندھی یہ جانتی بوجھتی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی اُس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اُس کی مالش کرے، تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اُس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اُس کے اندر داخل ہو اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کیے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تھا تو کئی بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود میں سُلا دے۔

پریم کر سکنے کی اہلیت اُس کے اندر اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہر اُس مرد سے جو کہ اُس کے پاس آتا تھا محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ وہ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اُس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اُس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا تھا "سوگندھی ——— تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور اُن کی راتیں، اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُسے وہ خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جس کی خواہش اُس کے دل میں موجود تھی تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اُس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اُسے کون سے محل کھڑے کرنا تھا جو وہ روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اُس کا عام نرخ تھا۔ جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے

اُسے روز ہی مل جایا کرتے تھے ۔ جو کہ اُس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے، بقول رام لال دلاّل ، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا تو کیا وہ اُسے دس پندرہ روپے خراج ادا نہیں کیا کرتی تھی ۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلاّل ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی اب اس کو چھپانا کیا ہے ۔ بتا ہی کیوں نہ دیں! ــــ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے ! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے ؟ ــــ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں ؟ ــــ چھی چھی چھی ــــ دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلاّل کے باقی رہے ساڑھے سات ؟ ــــ اب ان ساڑھے روپے پر تو مجھے وہ چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں وہ چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ــــ مجھے عورت چاہیئے' پر تجھے کیا اس وقت' اسی گھڑی مرد چاہیئے ؟ ــــ مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں! ــــ تیرا میرا ناتا ہی کیا ! کچھ بھی نہیں ــــ بس یہ دس روپے جن میں سے ڈھائی دلاّلی میں چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ــــ تو بھی اُن کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ــــ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ ــــ پُونے میں حوالدار ہوں ۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے۔ یہ دھندا چھوڑ ــــ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا ــــ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں۔ بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ــــ "سوگندھی۔ بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ــــ اور پانی کا یہ گھڑا ــــ دیکھو تو کتنا میلا ہے اور یہ ــــ یہ چیتھڑے ــــ یہ چندیاں ــــ اُف کتنی بُری باس

آتی ہے۔ اُٹھا کے باہر پھینک اِن کو ـــــ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھُل مِل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال کیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی نے اُس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اُس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا۔ "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ـــــ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں"۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں۔ اس نے سوگندھی کو ـــــ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آیا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔ "دیکھ سوگندھی، اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ـــــ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ......؟"

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا کہ تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟ اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں" ـــــ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جس کو اوف کرنا وہ

بھول گئی تھی اُس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اُس کی تیز روشنی اُس کی مُندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلودہ کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دو رلی مُلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں مچھلی کے ریزوں نے اُس کے مُنہ کے اندر ایک ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو کہ بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلّو سے اُس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ اُس نے جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھا تو اُس کا کتّا سوکھے ہوئے چپلوں پر مُنہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی مری چیز کا مُنہ چڑا رہا تھا۔ اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اُٹھی۔ اُس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اُس نے کُلّی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اُس نے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا بھُنّا کر کہنے لگا۔ "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ تو کہاں مر گئی تھی؟" پھر آواز دبا کر اُس نے ہولے سے کہا۔ "اندر کوئی اور تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا۔ "نہیں"، تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ــــــ بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا۔ اب تو میرا مُنہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اُتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور میرے ساتھ چل ــــــ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ــــــ چل چل ایک دم جلدی کر۔" سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے پاس کھڑا ہو کر اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اُٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔

"رام لال، آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ "تو پہلے کہہ دیا ہوتا۔"
سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔

"وہ بات نہیں رام لال۔ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ——— "بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی آگیا "تھوڑی بچی ہو تو لا ——— ہم بھی ذرا منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا ——— "اگر بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ——— دیکھو رام لال۔ وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اُسے اندر ہی لے آ۔"

رام لال نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ——— تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل ——— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اُس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ اُسے کبھی قبول نہ کرتی مگر اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اُس کی ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی۔ جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لیئے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اُس کو ڈھارس دی تھی اور اُس سے کہا تھا۔ "بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونہ سے آنے ہی والا ہے۔ میں اُس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔"
مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اُس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑی پہنی اور گالوں پہ سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پی کر وہ رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی بہ نسبت بہت دھندلی روشنی دے

رہے تھے ۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی ۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آتا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ــــــ سوگندھی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا سا اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور .یوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے ۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔" لیجئے وہ آگئی ــــ بڑی اچھی چھوکری ہے ۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اُسے دھندا شروع کیئے ــــــ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔" سوگندھی اِدھر آ۔ سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اُس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اِس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے" اونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا ....

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھُسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی ۔یہ آخر کیا ہوا تھا۔ اِس" اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو کہ ابھی تک اُس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ ...... کیا؟"

رام لال دلال کی آواز سُنائی دی :" پسند نہیں کیا تجھے؟ ــــ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیئے۔"

یہ سُن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اُس کی باہنوں میں ــــــ اُس کے ہاتھوں میں، ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر ــــ کہاں تھا وہ سیٹھ ــــ تو" اونہہ"، کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا ــــ اُس کی..... گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آکے رک گئی۔ وہ آخر

گالی کیسے دیتی۔ موٹر تو چل چکی تھی۔ اُس کی دُم کی سُرخ بتی اُس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ۔ او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی' ___ بس ایک منٹ کے لئے۔" پر وہ سیٹھ، تھڑی ہے اُس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

سنسان بازار میں وہ کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو کہ وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کی ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اُس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اُڑا دے۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ، اونہہ" کہہ رہی ہے!

گالوں پر اُس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی۔ جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگار اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے لیے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آ گیا۔ اِس شرمندگی کو دور کرنے کے لیے اُس نے کیا کچھ نہ سوچا ___ "میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے ___ پر ___ پر ___ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور ___ اور ___ یہ بازار ___ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک ___ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اُس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑپھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سُنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو کہ سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اُس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا محسوس ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اُس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اُسے معلوم ہوا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اُس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اُن کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی

طرح اُس کا سارا انگ دُکھنے لگے ۔ اور سر میں درد ہو ۔ اُس کی ٹانگوں میں درد ہو، اُس کے پیٹ میں درد ہو، اُس کی بانہوں میں درد ہو ـــــ ایسا درد ہو کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے ۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوا ـــــ کیا درد تھا؟ ـــــ ایک لمحے کے لئے اُس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا ـــــ یہ کیا تھا؟ .... لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اس کے اندر کبھی سکڑتی تھی اور کبھی پھیلتی تھی ۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اُٹھتے ہی تھے کہ رُک گئے، اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی "۔ رام لال دلاّل کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی ـــــ شکل کا تو اُس نے ذکر نہیں کیا ۔ اُس نے تو یہ کہا تھا! سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا؟ اُسے ـــــ اُسے ـــــ اُسے میری شکل ہی پسند نہیں آئی نہیں آئی تو کیا ہوا؟ ـــــ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ـــــ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا ۔ کتنی بُری صورت تھی اس کی ـــــ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی، جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ـــــ کیا مجھے اُبکائی آتے آتے نہیں رُک گئی تھی؟ ـــــ ٹھیک ہے، پر سوگندھی! ـــــ تو نے اُسے دُھتکارا نہیں تھا ۔ تو نے اُس کو ٹھکرایا نہیں تھا ـــــ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے مُنھ پر تھوکا ہے "اونہہ" ـــــ اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ـــــ یہی کہ اِس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل ـــــ اونہہ ـــــ یہ مُنہ اور مسور کی دال ـــــ ارے رام لال! تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے ـــــ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا تھا تو ـــــ دس روپے اور یہ عورت ـــــ خچر کیا بُری ہے ....

سوگندھی یہ سوچ رہی تھی اور اُس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سُر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں ۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلاّل پر جس رات کے دو بجے اُسے بے آرام کیا ۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پاکر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی ۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کی

آنکھیں، اُس کے کان، اُس کی بانہیں، اُس کی ٹانگیں، اُس کا سب کچھ مُڑتا تھا کہ اُس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ـــــ اُس کے اندر یہ خواہش بڑی شدّت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ـــــ صرف ایک بار........ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک بیٹری نکالے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ ـــــ سوگندھی ـــــ اندھا دُھند اپنے دونوں پنجوں سے اُس کا مُنہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلّی کی طرح جھپٹے اور ـــــ اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو کہ اُس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اُس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ـــــ بالوں سے پکڑ کر وہ اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ اُس کو مکّے مارنا شروع کر دے۔ اور جب تھک جائے ـــــ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اِس لئے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں غصّے اور بے بسی کی شدّت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ "تم روتی کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے کہ تم ٹپکنے لگی ہو؟" ـــــ آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو کہ اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی اِن آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ـــــ یہ آواز کہاں سے آئی ـــــ؟ سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر کو دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ـــــ ارے! یہ تو اُس کا دل پھڑپھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اُس کا دل ـــــ یہ کیا ہو گیا تھا اُس کے دل کو! ـــــ آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اِسے ـــــ یہ اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ـــــ بالکل اُس گِھسے ہوئے کارڈ کی جگہ جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رُک جاتا تھا۔ "رات کٹی گِن گِن کے تارے"۔ کہتا تھا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

کتنے سندر ہیں"—— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے، پر جب اُس نے سُندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کودا۔" یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے —— کیا بھول گئی ہے کہ ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے ؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کرکے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جوان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ و روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ آج سے پانچ سال پہلے تھا جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہوگئی تھی۔ اُس کی شکل و صورت اُن تمام عورتوں کی سی تھی۔ جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اُس کے اعضاء متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود اُن کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہوکر گیا ہو—— وہ بڑی ملنسار تھی۔ بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب کہ وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جاکر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوے کو غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اُس کے پاس واپس جانے کے لئے کرائے کے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھاکر اُس کے دس روپے واپس دے دئے تھے——

"مجھ میں کیا بُرائی ہے ؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ۔ لوہے کے کھمبے۔ فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری —— ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں، جو اُس کی طرف جُھکا ہوا تھا، مگر سوگندھی کو

کوئی جواب نہ ملا۔

جواب جو اُس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں۔ اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ــــ کوئی ــــ کوئی ــــ اُس وقت کوئی اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے "سوگندھی کون کہتا ہے کہ تو بُری ہے۔ جو تجھے بُرا کہے وہ آپ بُرا ہے"۔ ــــ نہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا "سوگندھی تو بہت اچھی ہے"۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اُس کی تعریف کرے۔ اِس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدّت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی تھی۔ جیسے وہ اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ کیوں ماں بن رہا تھا ــــ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔ ــــ اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ــــ اپنے گرم گرم گال! اور اُس کی ساری سردی چُوس لے۔

تھوڑی دیر کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ۔ لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سنّاٹے میں اُس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ اور اُس کے اوپر جُھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے   لیکن اس کے اندر یہ گڑبڑ کیا تھی؟ وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے   اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کُھل جائے، اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا ہے۔ اِن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو   کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ــــ

ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو کہ اُس کے کھُلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے۔ کھڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بہ یک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ـــــ اُس کی کتنی زبردست خواہش تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ـــــ اور ـــــ

"نہ آئے ـــــ بلا سے ـــــ میں اپنی جان کیوں بے کار ہلکان کروں۔ ـــــ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ اِن جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے ـــــ چل سوگندھی، گھر چل، ـــــ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سوجا ـــــ فسٹ کلاس نیند آئے گی۔ اور سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سیٹھ اور اُس کی موٹر کی ایسی تیسی ـــــ"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کے سینے پر سے بوجھ ہلکا ہو گیا اور اُس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اُسی طرح اب ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف جب وہ چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

جب وہ اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے روئیں روئیں پر چھا گیا ـــــ اُس کے قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اِس بات کو شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے۔ کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ـــــ اُس سیٹھ نے ـــــ پرماتما کرے ...... سوگندھی نے چاہا کہ اُسے کوئی بددُعا دے، مگر سوچا، بددُعا سے کیا بنے گا، مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ـــــ اس کے مُنہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر وہ بے چین رہتا ـــــ کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ـــــ "یہی لینے آیا تھا تو؟ ـــــ لے، دام دے بنا لے جا اسے ـــــ پر جو کچھ کہ میں ہوں، جو کچھ کہ میرے اندر چھپا ہوا

ہے۔ وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ——

انتقام لینے کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے۔ اگر اُس سیٹھ سے ایک —— صرف ایک —— اُس کی مُڈ بھیڑ ہوجائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں۔ یہ نہیں۔ یہ کرے —— یوں اُس سے انتقام لے۔ نہیں یوں نہیں۔ یوں۔ —— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا بالکل محال تھا تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کرلیتی۔ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی۔ جو اُس کی ناک پر چیکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں پر جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے اُس نے چابی نکالی اور تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا! سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کرکے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا؛ —— صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اُٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سُستی دور ہو جائے گی۔ اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہوجائے گا، جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے —— وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہوگی تو —— کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی۔ تو یہ ضروری نہیں ہوا کرتا تھا کہ مادھو اُس میں حصّہ لے —— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کُرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اُس کے تیل سے چپڑے ہوئے سَر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں

پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔" میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

مادھو بڑا سٹپٹایا۔" انتظار! ـــــ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں؟"

سوگندھی کے بھچے ہوئے لب کھلے۔ اُن پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا ـــــ اُٹھی تو کوئی بھی نہ تھا، سو، جی نے کہا چل کہیں باہر گھوم آ .... اور ...."

مادھو خوش ہو کر بولا۔" اور میں آگیا ـــــ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے ـــــ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا۔" چار بجے کے قریب۔"

مادھو کرسی پر سے اُٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔" اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا ـــــ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی ـــــ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے تیرے ہاتھوں میں ـــــ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں؟ ـــــ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا" مادھو تو چنتا کیوں کرتا ہے؟ ـــــ لے یہ تھیلی ـــــ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟" سوگندھی۔ تیری جان کی قسم فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رُخ کیا ـــــ کیا سناؤں، بڑی پریشانی ہے؟ ـــــ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے روپے ہوں تو سب انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے ـــــ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دباؤں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے۔ ـــــ ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ اُن پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اُس لہجے میں جو کہ اُس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی۔" مادھو یہ کس موئے نے

تجھ پر کیس کیا ہے؟ جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ——— بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر اگر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے۔ ——— جان بچی لاکھوں پائے ——— بس بس اب جانے دے۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے ——— مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سُنا ——— کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ——— واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے مُنہ سے شراب کی باس آئی۔ اُس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔" دوپہر کی گاڑی واپس جانا پڑے گا ——— اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس روپے نہ تھمائے تو .... زیادہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس"! یہ کہہ کے سوگندھی بڑے آرام سے اُٹھی اور اُن چار تصویروں کے پاس گئی جو کہ دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں پڑی تھیں۔ تصویر اُترواتے وقت تصویر اُتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اُس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی" ہمارا فوٹو اُترے گا۔ ہمارا فوٹو اُترے گا۔"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اُترواتے وقت اُسے بہت تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— اُس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نکیلی تھی کہ مادھو کو سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اُٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں طرف کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی۔" اِس کی ——— منشی پالٹی کے اِس داروغے کی .... ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا ——— کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ———

"اونہہ! یہ مُنہ اور مسور کی دال" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار

میں سے کیل بھی پلستر سمیت اُکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سُنائی دی تو سوگندھی نے کہا۔ "رانی بھنگن کچرا اُٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی لے جائے گی۔"

اب کی بار پھر اِسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ اُن پر چاقو یا چھُری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا، پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی......"

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ "اِس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟ —— بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا ...... کیوں مادھو؟"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور ہنسا۔ "ہی ہی ہی......"

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے آدمی کی تصویر اُتاری اور دوسرا ہاتھ اُس فریم کی طرف بڑھایا۔ جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اُس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اُس نے ہنس کر اتنا کہا۔ "اچھا کیا —— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا —— پر میں پوچھتی ہوں کہ تجھ میں ایسی کون سی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے —— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا۔ یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے۔ یہ تیرے مُڑے ہوئے کان، یہ تیرے مُنہ کی باس، یہ تیرے بدن کا مَیل؟ —— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ.. پسند کیوں ہوتا، ترے عیب

جو اُس نے چھپا رکھے تھے........ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے کہ جو عیب چھپائے وہی بُرا ـــــــ"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اُس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے۔ "دیکھو تو سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے ـــــــ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ـــــــ"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اگر تو نے پھر اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چُٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ـــــــ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ "میں بتاتی ہوں ـــــــ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ـــــــ اور دس روپیہ میرا بھاڑا ہے ـــــــ اور جیسا کہ تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلاّل کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے روپیوں میں میں نے وہ چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو وہ چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا ـــــــ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں، بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی تھی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ـــــــ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔ آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی اُن کا بجنا سُن رہا ہے اور میں بھی اُن کا بجنا سُن رہی ہوں ـــــــ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گذری اور اُس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے یہ چندیاں ـــــــ اُف کتنی بُری باس آتی ہے۔ اُٹھا کے باہر پھینک اِن کو........"

مادھو چلّایا" سوگندھی"!

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔" سوگندھی کے بچّے تو آیا کس لئے ہے یہاں ؟ ـــــ تیری ماں رہتی ہے اِس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی ؟ یا تو کوئی ایسا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں .... کتّے، کمینے، مجھ پر رُعب گانٹھتا ہے ؟ میں تیری دَبیل ہوں کیا؟ ـــــ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے ـــــ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون ؟ ـــــ چور ہے یا گٹھ کترا؟ ـــــ اس وقت تو میرے مکان میں کیا کرنے آیا ہے ؟ ـــــ بلاؤں پولس کو؟ ـــــ پونہ میں تجھ پر کیس ہو یا نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کردوں ـــــ"

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا" سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے ؟"

" تیری ماں کا سر ـــــ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ ـــــ بھاگ یہاں سے، ورنہ ـــــ" سوگندھی کی بلند آواز سُن کر اُس کا خارش زدہ کتّا جو کہ سوکھے ہوئے چپلوں پر مُنہ رکھ کر سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اُٹھا اور مادھو کی طرف مُنھ اُٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتّے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اُٹھانے کے لئے وہ جُھکا تو سوگندھی کی گرج سُنائی دی۔" خبردار ـــــ وہیں پڑی رہنے دے ـــــ پونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کردوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے خارش زدہ کتّے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتّا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا تو اُس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے کان پھڑ پھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اُس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سنّاٹا دیکھا۔ ایسا سنّاٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اُتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے ...... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اُس نے

کافی دیر تک اِس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی اور اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتّے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

عصمت چغتائی

بچھّو پھوپی

جب پہلی بار میں نے اُنھیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کُھلتی تھی اور قانوناً اُسے بند رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے، کوئی شادی، بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی، رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بُلا دیتے اور غریب کے گھر میں بھی وحیدہ جان، مشتری اور انوری کہروا ناچ جاتیں۔

مگر محلّے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں اُن کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بند اور گیندا آئے دن تاک جھانک کے سلسلہ میں سر پھٹول کیا کرتے تھے۔ ویسے رحمان بھائی محلّے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیوی کی زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اُس یتیم سالی کا سوائے اُس بہن کے اور کوئی مَرا جیتا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اُس کے بچّے پالتی تھی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی۔ باقی سارا گُوموت وہی کرتی تھی۔ اور پھر کسی نک چڑھی نے اُسے بہن کے بچّے مُنہ میں ایک دن چھاتی دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچّوں میں آدھے بالکل ”خالہ“ کی صورت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان کی دُلہن چاہے بہن کی دُرگت بناتی ہوں، کبھی پنچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں جو کنواری کو کہے گا، اُس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا۔“ ہاں بر کی تلاش میں ہمیشہ سوکھا کرتی تھیں، پر اس کیڑے بھرے کباب کو بر کہاں جڑتا، ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پُھلی تھی۔ پَیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کولھا دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلّے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا

تو وہ دھونس جما کر کہہ دیتے۔ محلے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہی کیا کم عنایت تھی۔ رحمان بھائی اُسی کو اپنی عزّت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ باقی محلے کے لوگ ابّا سے دبتے تھے۔ مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اُس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپھی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی تھیں۔

امّاں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں، جیسے بجّو پھوپھی کی آواز اُن پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ چھٹے چھ ماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں، ابّا میاں اُن سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپھی بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود، پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مُڑ مُڑ اپنی پیاری پھوپھی کے کوسنے سُنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھتی تھیں وہ اُن کے طول طویل جسم سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ابّا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اُتار کر ڈوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سُننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے اُنھیں تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی! اور آواز تو ماشاءاللہ ابّا میاں سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی۔

پھوپی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن پھوپھا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں۔ پھوپی نے بٹّے سے ساری چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں۔ رنگا دوپٹہ اتار دیا اور اُس دن سے وہ اُنھیں "مرحوم" یا "مرنے والا" کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انھوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیے۔

یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور جب سے وہ "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھوپھا ہماری امّاں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا۔ میرے ابّا میری

اماں کے چچا لگتے تھے۔ اور شادی سے پہلے جب وہ چھوٹی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر اُن کا پیشاب نکل جاتا تھا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی ہے تو اُنھوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپھی کی پٹاری سے افیون چُرا کر کھالی تھی۔ افیون کچھ زیادہ نہیں تھی اور کچھ دن وہ لوٹ پوٹ کر اچھی ہوگئیں، اُن دنوں ابا علی گڈھ کالج میں پڑھتے تھے۔ اُن کی بیماری کی خبر سُن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے۔ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی، اُنھوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا۔ جتنی دیر وہ رہے، بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے اُن کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

"اُمراؤ بھائی! اگر اُنھیں کچھ ہوگیا......... تو........" دیو کی آواز لرز رہی تھی۔

نانا میاں خوب ہنسے۔

"نہیں برادر خاطر جمع رکھو۔ کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری مُنّی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اُس کے دل سے ایک دم دیوزاد انسان کا خوف نکل گیا تھا۔ جبھی تو میری پھوپی بادشاہی کہتی تھیں، میری اماں جادوگرنی ہے اور اُس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر بیٹ گرا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سُنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ ہمیں اُن کی مار فراموش ہوجاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر یہ گالیاں سُن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے: "کیوں پھوپی، آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری میّا کا کلیجہ۔" اِس بے تکے جواب سے پھوپی جل کر مُرندا ہوجاتیں، ابا پھر جواب دلواتے۔

"ارے پھوپی، جب ہی مُنہ میں بواسیر ہوگئی ہے۔ جُلاب لو جلاب!"

وہ میرے نوجوان بھائی کی مچیاتی لاش پر کوّوں، چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔ اُن کی دُلہن کو جو نہ جانے بیچاری اُس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولہا کے عشق میں لرز رہی ہوگی، رنڈاپے کی دُعائیں دیتیں۔ اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بُدبُداتیں۔

"جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔"

پھر ابّا اُکساتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔

"پھوپی بادشاہی، مہترانی پھوپی کا مزاج تو اچھا ہے اور ہمیں ڈر لگتا کہ کہیں پھوپی کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔

"ارے جا سنپولئے، میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے مُنہ مسل دوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچّہ ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔"

"رحمان بھائی، اے رحمان بھائی، اِس بورانی کُتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے!"

ابّا کے سکھانے پر ننھے بھائی دوڑتے ہوئے بولتے۔ حالانکہ اُنھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی کیونکہ سب جانتے تھے کہ آواز اُن کی ہے مگر الفاظ ابّا میاں کے ہیں، لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پر نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابّا کی شکل کی پھوپی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے اُنھیں پسینے آجاتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں۔ ننھیال حکیموں کی گلی میں تھی اور ددھیال گاڑی بانوں کے کٹھرے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے جنھیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا۔ ہندوستان میں اُسے بسے عرصہ گذر چکا تھا۔ رنگتیں سنولا چکی تھیں۔ نقوش نرم پڑ چکے تھے۔ مزاج ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ددھیال باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے کھڑے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے مُنہ، گُریلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں، شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے، شاعرانہ طبیعت کے دھیمی آواز میں بولنے چالنے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے۔ جبھی محلّے کا نام حکیموں کی گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ شال باف، زردوز اور عطّار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالانکہ میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی، پہلوانی، نیزا کی میں

نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے، ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھنچ کر آگئے، یہ میل کب اور کس نے شروع کیا۔ سب شجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر ایک چھوٹی سی بہن بِن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنی بہن بقول پھوپھی بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے 'مرحوم' شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بددعائیں دیا کرتیں۔ جنھوں نے خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میری پھوپی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا۔ میرے ابا میاں اور میرے چچا، بڑے دو اُن سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تین بھائیوں کی ایک بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں۔ شہ سواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی۔ ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی چار عورتوں جتنا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

"بیگم، بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

"اوئی توبہ میری، عالم فاضل باپ کی بیٹی" میری اماں کان پر ہاتھ دھر کر کہتیں۔ مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپی کو چیلنج بھجواتے۔

"پھوپی، ہماری اماں سے کشتی لڑوگی؟"

"ہاں، ہاں۔ بُلا اپنی اماں کو۔ آجائے خم ٹھوک کر۔ ارے اُلو نہ بنادوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بُلا، بُلا مُلّا زادی کو......... اور میری اماں اپنا گھٹنو کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دبک جاتیں۔

پھبتی بادشاہی، دادامیاں گنوار تھے نا؟ بڑے ناناجان اُنھیں آمدنامہ پڑھایا کرتے تھے۔" ہمارے پرنانا کے داداجان نے کبھی دادامیاں کو کچھ پڑھادیا ہوگا۔ آبامیاں چھیڑنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔

"ارے وہ استنجے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے، جنھوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیرو مرشد کہا تھا، مگر پھوپی کہتیں۔ "خاک پیرو مرشد کی دُم! مجاور تھے مجاور۔"

تین بھائی تھے، مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، اُنھیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابّا گورنمنٹ سروس میں تھے۔ اُنھیں غدّار اور انگریزوں کے غلام کہتیں، کیونکہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر ڈالی، ورنہ آج "مرحوم" پتلی دال کے کھانے والے جولاہے یعنی میرے پھوپا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی بڑے چچا دس نمبر کے بدمعاشوں میں تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر اُن کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انھوں نے کئی قتل کئے تھے، ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ اُنہیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو اُن کے کیریئر کو دیکھتے ہوئے قطعی پُھسپُھسا لفظ تھا۔

مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں "مُنہ جلے۔ نگوڑی ناہٹی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اُن کو خبر ہوگئی تو دُنیا کا نہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں۔ اگر چھوٹا سُن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھمادے۔ ڈاکو ہے ڈاکو۔ ——— اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑادے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے۔ تیری عاقبت خاک میں ملادے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں، تیری اماں کی طرح شیخانی فتانی نہیں۔" مگر میرے پھوپا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی اُن ہی پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں۔ وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو [illegible] کر عید گاہ سے سیدھے پھوپھی اماں کے ہاں

کوسنے اور گالیاں سُننے جایا کرتے، وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھڑی میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بُلا کر سویّاں بھجوا دیتیں۔ مگر یہ کہتیں "پڑوسن نے بھیجی ہیں۔"

"ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے؟" ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے چیتھڑے بکھیرے جاتے۔ سویّاں کھا کر ابا عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں، کہ "اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں۔" اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔

"حرام زادو! اگر ابا اماں کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتّوں کو کھلا دوں گی۔" اماں ابا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابا میاں نہ جا پاتے تو پیغام پر پیغام آتے۔ "نصرت خانم بیوہ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا۔" بُرے بُرے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آجاتیں۔

ایک دن عید کی سویّاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابا میاں کو اُلٹی ہو گئی۔

"لو بادشاہی خانم، کہا سُنا معاف کرنا، ہم تو چلے۔" ابا میاں نے کراہ کر آواز بنائی۔ اور پھوپی لشتم پشتم پردہ پھینک چھاتی کوٹتی نکل آئیں۔ ابا کو شرارت سے ہنستا دیکھ کوستی لوٹ گئیں۔

"تم آگئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے۔" ابا نے کہا۔ نہ پوچھیے پھوپی نے کتنے وزنی کوسنے دیے۔ انھیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا۔" اور ابا چڑانے کو انھیں دو روپے بھجوا دیتے۔

بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دے دیں تو انھیں بیل تو ملنی ہی چاہیے۔ اور پھوپھی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

"بیل دے اپنی اماں بہنیا کو۔" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔ خود ہی کہتیں۔

"اے بادشاہی بندی، تیرے مُنہ کو کالک لگے۔ اپنی میت آپ پیٹ رہی ہے" پھوپی کو اصل میں بھائی سے ہی بَیر تھا۔ بس اُن کے نام پر آگ لگ جاتی۔ ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آجاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے "نچھو نچھو" کہتیں۔ "بچے تو اچھے ہیں"۔ وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اُسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔ اماں اُن کی بھتیجی بھی تو تھیں۔ بھئی کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں۔ ایک رشتے سے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی۔ اس طرح میرے ابا میرے دولھا بھائی بھی ہوتے تھے۔ میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھوپی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی، یعنی ابا کی پھوپی جب لبِ دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمارداری کو پہنچے۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے۔ اور مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ اُن کی پھوپی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپی کو کچھ ڈر، خوف تو تھا نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں کی طرف سے اُنھوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور پندرہ برس کی مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ پیتی ہی تو اُنھیں لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے لچک دار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڑے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار کر سو جاتے تو یہ فرماں بردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم، ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔ جب مسرت جہاں برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لرزتی، کانپتی گاؤتکیے کے سہارے اُٹھ بیٹھیں۔ اُٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو حکم ہوا "قاضی کو بلواؤ۔"

لوگ پریشان تھے کہ بُڑھیا قاضی کو کیوں بُلا رہی ہے۔ کیا آخری وقت سُہاگ رچائے گی، کس کو دم مارنے کی ہمت تھی۔

"دونوں کا نکاح پڑھاؤ۔" لوگ چکرائے کن دونوں کا۔ مگر مسرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہوکر گریں اُدھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے۔ چور پکڑے گئے۔ نکاح ہوگیا، بادشاہی پھوپی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی۔ دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کے لئے بس یہی حد تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھوپی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر اُنھوں نے کُشتے کے پُشتے لگادیئے۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا میاں دولھا دولھن کو اپنے گھر لے آئے۔ اماں تو چاند سی بھابی کو دیکھ کر نہال ہوگئیں۔ بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔

بادشاہی پھوپی نے اُس دن سے بھائی کا مُنہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کرلیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دُنیا سے مُنہ پھیرلیا۔ اور ایک زہر تھا کہ اُن کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔

"بڑھیا نے پوتے کے لیے میری بچّی کو پھنسانے کے لئے مکر گانٹھا تھا۔"

وہ برابر یہی کہے جاتیں کیوں کہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جیئیں۔ کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں پھوپھی۔

مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا۔ جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آگیا تو اُنھوں نے پھوپھی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے۔ دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آجاؤ۔"

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چُھپے تھے۔ بھیّا نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں ترازو ہوگئے۔ بلبلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اُس ڈیوڑھی پر اُتریں جہاں اب تک انھوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

"لو بادشاہی، تمھاری دُعا پوری ہو رہی ہے۔" ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپی بادشاہی باوجود بالوں کے دہی مُنّی سی بچّو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے مچل مچل کر بات منوالیا کرتی تھیں۔ ان کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک میمنے کی معصوم

آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو اُن کی سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ہمیں کوسو بچھو بی" ابّا نے پیار سے کہا۔ میری امّاں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی۔

"یا اللہ............ یا اللہ.........." انھوں نے گرجنا چاہا۔ مگر کانپ کر رہ گئیں۔ "یا......... یا اللہ......... میری عمر میرے بھیا کو دیدے......... یا مولا........... اپنے رسولؐ کا صدقہ........" وہ اُس بچے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے مُنہ فق ہوگئے۔ امّاں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یا خدا آج بچھو پھوپی کے مُنہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابّا میاں مسکرا رہے تھے۔ جیسے اُن کے کوسنے سُن کر مُسکرا دیا کرتے تھے۔

سچ ہے، بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

عصمت چغتائی

"عشق پر زور نہیں......"

"اے آپا، کچھ سُنا"۔ وہاب چچا کی دُلہن کے ناک کے غدود پھول گئے تھے۔ میں نے اُن کی ناک سے خون نکلتے نہیں سُنا۔ وہ بھد بھد کرتی بڑے ابا والی ڈیوڑھی سے اُتریں۔ اُن کی گود میں اُن کا دسواں بارہواں اسقاط تھا۔ ننھے بھائی اُن کے ہر بچّے کو اسقاط کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ جوں ہی اُن کا پیر بھاری ہوتا وہ اسقاط کے لئے ہاتھ پیر مارنا شروع کردیتیں، دور دور کے محلّوں کی دائیاں اور مہترانیاں ہار جاتیں اور ٹلوا ہیاؤں ہیاؤں آہی جاتا۔ مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا قد ہوگا۔ مگر قطر بھی اتنا ہی ہوگا...... بس گول جیسے ہوا بھری فٹ بال، پیٹ خالی ہونا جو کہ بہت ہی تھوڑے وقفہ کے لیے ہوا کرتا تھا۔ تب بھی وہی حالت رہتی۔ انچ دو انچ کا فرق تو وہ جب ڈٹ کر رجب کے کونڈے کھاتی تھیں۔ جب بھی ہوجاتا تھا۔ سلیپر کھِسلتی وہ دھپ سے آکر بیوی کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ بیوی اور اُن کی پٹاری چھنک اُٹھے۔ ہم اپنی امّاں کو نوکروں کی دیکھا دیکھی بیوی ہی کہتے تھے۔

"اے ہے موت آئے، نگوڑے نے مُوت دیا"۔ وہ لونڈے کو پائینتی پر ٹکا کر "شی شی" کرنے لگیں۔ بیوی جل گئیں۔ "کم بخت نے موت دیا تو اُس میں کوسنے کی کون سی بات ہے؟"

"اے ڈہنی میں تو اُس کا ذکر کر رہی تھی آپا، خلیفن ڈے ڈکاح کرلیا۔"

"اوئی...... خلیفن نے نکاح کرلیا...... کب؟...... کس سے؟"

بیوی ناک پر سروتا رکھ کر چونکیں۔

"پچھلی جیرات کو...... ممّد میاں سے"۔

"اے خدائی خوار کو یہ بڑھاپے میں کیا چونچلے بگھارنے کی سوجھی"۔

''اللہ جاڑے'' وہاب چچا کی دُلہن نے گریبان کھول کر لونڈے کا دستر خوان لگا دیا۔ اللہ، کیا بدن تھا۔ ہم لونڈیاں بالیاں تو شرم سے پانی پانی ہو جایا کرتی تھیں۔ بچوں کے ناشتہ دان تھے کہ مراد آبادی لوٹے۔ پچھلا اسقاط تو اسی لوٹے کے نیچے دب کر جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ رات کے سوتے میں مُنہ میں دودھ دیا۔ نہ جانے کیسے نیند میں کروٹ لی کہ مُنہ اور ناک پر ڈھائی تین سیر گوشت آن پڑا۔ بیچارے کا دم گھُٹ گیا۔ مر گیا۔ اُن کا جسم دیکھ کر مجھے خیال آیا کرتا تھا شاعر کو عورت کے اس حصۂ جسم سے بڑا عشق ہے۔ دیکھ، بس ایک دفعہ وہاب چچا کی دُلہن کو تو جی بھر جائے۔

خلیفن پینتالیس سال کے پیٹے میں ہوں گی۔ خلیفہ کو مرے چار پانچ سال ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں شریف عورت اس عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور کسی سے دل لگانے کی بجائے خدا سے لو لگاتی ہے۔ کوئی نگوڑی ناٹھی نہ تھیں۔ دو بیٹے۔ دو بیٹیاں، چھوٹی بیٹی بکو میرے ساتھ دھن کوٹ کے مدرسے میں روز تختیوں سے پیٹی جاتی تھی۔ باقری کا رحمن بھائی کے لونڈے اتو سے دھاکے کا عشق چل رہا تھا۔ کیوں کہ ڈلا کا کردار خاکسار ہی ادا کرتی تھی۔

خلیفن کا سِن نکاح کا نہ تھا۔ پھر ممد میاں اُن سے دو سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ بیوی ڈیڑھ سال ہوا چار بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ نگوڑے ناٹھے رہ گئے تھے۔ کیا دیو ہیکل انسان تھے۔ یہ لمبا قد، چوڑی چھاتی، چیچک رو، سیاہ بھجنگے۔ لکڑی کا دھندا کرتے تھے۔ چھتے پہ اُن کی ٹال تھی۔ خود مائتھان میں رہتے تھے۔ کبھی لکڑیوں کی ضرورت ہوتی خود چھکڑا لے کر آتے تو ڈیوڑھی پر ضرور آتے۔

''آپا بچھو ...... پان دان نہیں دو گی؟'' وہ زور سے ڈنکارتے۔ محلوں ٹولوں میں سب رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔ اماں جنھیں ممد میاں کی ہاتھی جیسی چنگھاڑ سے دل کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ جلدی سے پان لگا، پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر بھجوا دیتیں، ممد بھائی خاصدان میں پان لگ کر جانے والی حیثیت کے آدمی نہیں تھے۔ اُن کی بیوی جب زندہ تھیں، آتیں تو پلنگ کی ادوائن پر ہی بیٹھتیں۔ وہاب چچا کی دُلہن دھپ سے ہر جگہ بیٹھنے کا حق رکھتی تھیں۔

علیم الدین، کلیم الدین دو بیٹے ریلوے میں گڈس کلرک تھے۔ بڑی بیٹی زینب.

ہمارے ہی محلّہ میں یعنی پنجہ شاہی پر رہتی تھیں۔ اُن کے میاں کندے کا کام کرتے تھے۔ چھوٹی کا میاں فیض آباد میں تھانے دار تھا۔ وہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ خلیفہ نے اُنھیں کسی کا محتاج نہیں چھوڑا تھا۔ اپنا مکان تھا۔ دو کوٹھڑیاں اور کھپریل۔ گھر بیٹھے بٹھائے نیک بخت کو کیا مار پڑی کہ جوان جہان بیٹے بیٹیوں کا مُنہ کالا کرا دیا۔

زینب خالہ نے تو رو رو کر آنکھیں سُجا لیں۔ اُن کی نندوں نے اتنے طعنے دئے کہ کلیجا چھلنی کر دیا۔ انھوں نے جل کر پھندن کی منگنی اپنی بڑی نند کی لونڈیا سے توڑ دی۔ پھندن اپنی پھوپی زاد بہن سے پہلے سے منگا ہوا تھا۔

"پھندن کی منگنی ٹوٹ گئی .... پھندن کی دُلہن روٹھ گئی ..... پھندن کی ساس نے منگنی توڑ دی" گلی کے لونڈوں نے وہ نگوڑے کے پیچھے تالی دی کہ اُس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر کنکیاں لوٹا کرتا تھا۔ چھ برس کا پھندن مجنوں بن گیا۔

ڈھیلی ڈھالی خلیفن سے کسی کو اُمید نہ تھی کہ یوں بڑھاپے میں خصم کر لیں گی۔ مُوا سارا چونڈا بھسک ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں بتیسی سلامت تھی۔ سفید براق کپڑے پہن کر کبھی تیج تیوہار حصّے کی رکابی تھامے ہمارے ہاں آتی تھیں۔ اکیلی اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بڑی محبّت کی آدمی تھیں۔ بات بے بات بچّوں کو گھر میں بھرے رہتی تھیں۔ کبھی سنگھاڑے بانٹ رہی ہیں۔ کبھی بیر، کبھی کچھ نہیں تو مٹھی مٹھی چنے ہی بانٹ دیتیں۔ باری باری سب بیٹے بیٹیوں کے ہاں جا کر رہیں مگر کسی کو اُن کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے زبان کی ہمیشہ سے ..... کڑوی تھیں۔ پر خلیفہ کی موت نے تو زبان کی نوک میں زہر بھر دیا۔ جہاں جاتیں سیہی کا کانٹا بن جاتیں۔ میاں بیوی میں طلاقم طلاقا پر نوبت پہنچ جاتی۔ ویسے زینب آپا کی سسرال میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ خلیفن بھی رہ سکتیں۔ کلیم الدین کی بیوی سے اس لئے نہ بنی کہ وہ ٹھہریں فیشن ایبل۔ اُن کی بچّیاں گپّے سے بالوں میں ربن ڈالتیں۔ خلیفن کو ہول اُٹھتی۔ وہ تیل چپڑ کر مینڈیاں باندھ دیتیں۔ بہو نے صاف کہہ دیا۔ "یا تو اماں رہیں یا میں" ظاہر ہے کہ اماں کو بوریا بستر اُٹھا کر اپنے گھر لوٹنا پڑا۔ فیض آباد والی کے ہاں جی نہ لگا۔ گھر نوکروں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ذرا ذرا سی بات پر چوریاں پکڑتیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتیں۔ لازم تو یہ تھا کہ مزے سے دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ اللہ کی یاد میں وقت گزارتیں۔ مگر نہیں خلیفن کو تو چُل تھی۔ نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ گھر گھسر

سارے گھر میں گھُسی پھرتیں۔ اِدھر کی چیزیں اُدھر، ہر جگہ گھر میں تالے، نوکروں نے اُن کے خلاف محاذ بنالیا۔ زندگی دُشوار ہوگئی۔ ویسے میاں بیوی کو اپنی باتوں سے کب فرصت ملتی تھی جو اُن سے دو باتیں کرلیتے۔ نہ گھر میں بچّہ تھا کہ اُن کا جی بہلتا۔ چھوٹے نے صاف انکار کردیا۔ "یہاں آپ کو قباحت ہوگی۔ میں خرچہ تو بھیج رہا ہوں پابندی سے۔" خرچے کی خلیفن کو کمی نہ تھی۔ صرف خرچہ ہی زندگی کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اُنھیں سجی ہوئی مورتی کی طرح بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اچھے خاصے گھر میں کون تھا اب کوڑا کرنے والا۔ پھر بھی جھاڑو دیتیں۔ خلیفہ زندہ تھے تب اتنی تنہائی نہ تھی۔ کتنے کام تھے۔ کیسا بھرا بھرا گھر لگتا تھا۔ ایک دم کی کتنی رونق تھی چھوٹے کی جب تک شادی نہ ہوئی تھی۔ زینت بھی باپ کی لاڈلی تھی، کیا مجال جو روز نہ آئے۔ اب مہینے گذر جاتے تھے۔ اُسے اپنے بال بچّوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ خلیفہ ہی اُن کی گود کا بچہ تھے۔ کئی سال سے چلنے پھرنے سے معذور ہوچکے تھے۔ خلیفن اُنھیں نرسوں سے زیادہ بنا سنوار کر رکھتیں۔ کُرتے کاڑھ کاڑھ کر پہناتیں۔ اُن کے گھٹنوں پر مالش کرتیں۔ حقہ دم دم بھر کر دیتیں۔ پچیس سال کا ساتھ تھا۔ خلیفہ اُن کے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ اُن کے پیار میں کتنا انہماک تھا کہ عبادت کا شُبہہ ہوتا تھا۔ وہ ایک پل کو اوجھل ہوجاتیں تو خلیفہ بچّوں کی طرح مچل اُٹھتے۔ مرتے مرگئے، کبھی پٹّی سے بیوی کی پلنگڑی جُدا نہ کی۔

رات کو خلیفہ اُن سے خلرٹ کرتے تو وہ نئی نویلی دُلہن کی طرح تنک کر کہتیں۔

"اے ہٹو، بڑھاپے میں یہ چوچلے نہیں بھاتے۔"

"ہوں، کیا سمجھتی ہو، میں اپاہج ہوں تو مرد بھی نہیں رہا۔" وہ کروٹ لے کر اُن کے پلنگ پر آرہتے۔ اسی لیے تو الگنی پر جازم تان دیا کرتی تھیں۔ جب بڑی بہو بیاہ کر آئیں تو اُنھیں اپنی جازم کے باندھنے پر بڑی شرم آئی۔ "ہے ہے جوان بیٹا کیا سوچے گا۔ بہو کیا کہے گی؟"

بہو مسکرائی۔ "اے ہمارے اماں ابّا تو جازمیں نہیں تانتے۔ یہ تو ابھی تک دُلہن دُلہا بنے ہوئے ہیں۔" اُس نے کئی بار کہا۔

"بکو مت۔" بیٹے نے ڈانٹا اور کروٹ لے کر روٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر یہ جازم یوں ہی تنی دیکھی تھی۔ اس کے دل میں اس کا احترام تھا۔ اُس کا اپنا وجود بھی اسی

جازم کا مرہونِ منّت تھا اور پھر آخری دنوں میں جب خلیفہ کا چل چلاؤ تھا تب بھی اُن کا ہاتھ خلیفن کے سینے پر نہ ہوتا تو اُنھیں نیند نہ آتی۔ کتنا تشکّر تھا اُن کے ہاتھ کے لمس میں۔ اور اب نہ انگنی تھی نہ ہی جازم کے باہر پڑے ہوئے جوان بیٹوں اور بیٹیوں کے کھٹولے۔ چڑیاں دانہ دُنکا چُگ کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں۔ نئی دُنیائیں بسائی تھیں۔ مگر خلیفن کا پنجڑا انسسان پڑا تھا۔ کبوتر کبھی کے دوت اُٹھا کرلے گئے تھے۔ کبوتری تنہا پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر کسی کا سہارا نہ تھا۔

خلیفن نے کھچڑی کی پتیلی بھوبل سے گھسیٹ کر پاس کرلی۔ اب کون سینی میں کھانا سجا کر ایک اپنی جان کے لئے لے جائے۔ چٹنی بھی نہیں پیسی۔ بڑے کو بڑی بھاتی تھی۔ گھی کی لمسی طاق پر رکھی تھی۔ مگر اُنھیں ہاتھ بڑھا کر اُتارنے کی توفیق نہ ہوئی۔ تیسرا روزہ تھا۔ افطاری انھوں نے سب کی سب مسجد میں بھجوادی تھی۔ دور دور کوئی اپنا نہ تھا۔ زینب اپنی سُسرال گئی ہوئی تھی۔ کتنا کہا گھُلے جارہی ہے۔ بچّی کو پڑھائی کا ہرج ہوگا۔ اسے میرے پاس چھوڑ جا۔ مگر کون چھوڑتا ہے اپنی اولاد کو۔ انسان کس طرح کلیجہ پھاڑ کر پیدا کرتا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ دودھ چھُٹا کر جب بچّے کو روٹی چاول پر لگادو تو پھر وہ ماں سے ایسے نہیں چمٹتا، اولاد بیاہ دو تو اُس کے اپنے بال بچّے، اُس کی ساری محبت، سارا پیار لے لیتے ہیں۔ بوڑھے ٹھونٹ ماں باپ کے لئے کیا بچتا ہے؟ صحن میں مینہ کی جھڑی لگی تھی مگر خلیفن کی آنکھیں خشک تھیں۔

انھوں نے کھچڑی کی پتیلی چھینکے پر جوں کی توں اُٹھا کر رکھ دی۔ لوٹے سے ہاتھ دھو ڈالے۔ ایک رکابی وہ بھی چکنائی کی۔ دھونے میں کون سے ہل بیل لگتے ہیں۔ ہائے اسی باورچی خانے میں کبھی برتنوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا۔ تین چار پتیلیاں چھوٹی بڑی، آٹھ دس پلیٹیں، چمچے، کفگیر، تھالیاں، سینیاں مانجھتے مانجھتے کمر ٹوٹنے لگتی تھی۔ کیا پتہ تھا ایک دن ایک ہی پلیٹ رہ جائے گی، وہ بھی سوکھی۔

دروازے پر زنجیر کھڑکی ——— "کون ہوسکتا ہے؟ ——— الٰہی خیر.....

کہیں تار نہ ہو۔ اولاد اللہ نے دور بھیج دی تو پھر ممتا کی رگ بھی مسل دی ہوتی۔ تیری

بڑی قدرت ہے پروردگار۔"

"کون ہے؟" انھوں نے پلیٹ طاق میں رکھ کر پکارا۔

"دروازہ تو کھولو ____ میں ہوں ممدّ ____ کلّو کی ماں۔"

"ارے یہ رات کے وقت!" انھوں نے سر پہ بورا ڈال کر دروازہ کھولا۔ اور آڑ میں ہو گئیں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے ____" ممدّ نے دہلیز کے نیچے سر چھپاتے ہوئے مینہہ سے بچنا چاہا۔

"اے مردوئے، کھڑا پانی میں بھیگ رہا ہے۔ مُنہ سے نہیں پھوٹتا کیا بات ہے؟"

"وہ ____ وہ ____ کوئی دائی کا پتہ مل جاتا تو ____"

"اوہو ____ تو یہ بات ہے! چپ چاپ چُپاتے بیاہ بھی رچا لیا اور ہمیں پتہ نہیں۔"

"یہ بات نہیں، کلو کی ماں۔" دیوزاد ممدّ میاں نے بھیگی ہوئی مُردہ آواز میں کہا۔

"اے بھائی! یہ رات کے گیارہ بجے پانی آندھی میں پہیلیاں بُجھوانے آئے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

"اب ____ اب تم سے کیا کہوں ____ بنّو ____ بنّو ____"

"بنّو ____ اوئی کون بنّو؟"

"میری لونڈیا۔"

"اچھا ____ اچھا بنّو ____ اوئی بنّو نگوڑی ____ اے مردوئے تیرا چیتا پگھل گیا ہے کیا؟ ____ ہے ہے، یہ سب باسط کے لونڈے کے کرتوت ہیں۔"

"دائی کا پتہ بتاتی ہو کہ ____ میں جاؤں ____ لونڈیا کا اتنے میں دم نکل چکا ہوگا۔" ممدّ میاں بولے۔

"ہے ہے ____ اب اس وقت دائی کا پتہ کہاں سے بتاؤں ____ مسیتن کو باؤ گولے کا درد اُٹھا ہے۔"

"اسی کے ہاں سے آرہا ہوں۔"

"تم کہاں رہو ہو؟"

"مائی تھان ____ مگر میں ____ میں نہیں چاہتا۔ اللہ دی، بڑی حرام زادی

ہے۔ سارے محلہ میں پھونک دے گی۔ ویسے ہی رہنا دوبھر ہو رہا ہے —— اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جاکر حرام زادی کا گلا گھونٹ دوں۔" ممدّ میاں جلدی سے مڑ لئے۔

"اے ٹھہرو میاں! یہ بھی کوئی طریقہ ہے —— تم کہو تو میں چلی چلوں اور کیا ——"

"تم؟"

"ہاں، ایک سے دو اچھے ہووے ہیں —— اور تم ٹھہرے مرد آدمی کوئی سواری؟"

"اِکّہ ہے چھیدو کا ——"

بُرقعہ سر پر ڈال کر خلیفن نے چٹ لالٹین بُجھا ممدّ میاں کو تالا پکڑا دیا۔ اور لپک جھپک دوڑیں اِکّہ کی طرف۔ تالہ لگا کر ممدّ میاں بھی لپکے جلدی سے خلیفن کو سہارا دے کر خود اِکّہ ہانکنے لگے۔

"اور چھیدو موا کہاں ہے؟"

"پیے ہوئے پڑا تھا۔ بہت سر مارا۔ پھر میں اِکّہ لے کر چلا آیا۔ سالے کو کرایہ بھی نہیں دوں گا۔"

اندھیری کوٹھڑی میں کالی بُھجنگ چیختی ہوئی چمنی کی لالٹین بھڑک رہی تھی اور کھٹولے پر تیرہ چودہ برس کی تنکا سی لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"نئی میری لاڈو۔" خلیفن کا جی بھر آیا۔ اُنھوں نے بچّی کا مُنہ اپنے دوپٹّے کے کونے سے پونچھا۔ پھر اپنے آنسو ضبط کر کے ممدّ میاں پر چلائیں۔

"کیا میری چھاتی پر کھڑے ہو کاٹھ کے اُلّو کی طرح۔ کوئی صاف سُتھری چادر تو دو ——"

صاف سُتھری چادر کا اِس گندے سنڈاس گھر میں کیا ذکر، ممدّ میاں نے اپنی دُھلی ہوئی تہمد نکال کر دی۔ دو ایک قمیص بنیائن بھی خلیفن نے لے لئے۔ پھر کواڑ بھیڑ کر اُنھوں نے برقعہ ایک طرف ڈالا۔ اور آستین چڑھا کر بچّی پر جُٹ گئیں۔ گودڑ گھسیٹ کر سیدھا کیا۔

"اے کوئی دوسری لالٹین نہیں؟"

"ہوگی کہیں کوٹھڑی میں"۔

"بھوبل ڈالو۔ تم اسی کو صاف کرو۔ اتنے کوئی موم بتی دے دو۔" ممدّ میاں نے تیل کی کپّی پکڑادی۔ انھیں ہوش ہی نہ تھا کہ برقعہ نہیں ہے۔ ممدّ میاں کی آنکھیں نیچی رہیں۔ برآمدے میں ایک پانچ چھ برس کی لڑکی اور ڈیڑھ بنّو سے چھوٹے لڑکے سہمے ہوئے ٹکر ٹکر تک رہے تھے۔

"ان بچّوں کو تو سُلادو۔"

"حرام زادے تو تم ہو ممدّ میاں جو لونڈیا کی یہ دُرگت بنوالی۔ اور آنکھوں کی چربی نہ پگھلی۔"

مارے غصّہ کے ممدّ میاں کا منہ لال پڑ گیا۔ ایک دم بُھنّا کر بولے۔ "چولھے میں جاؤ ـــــ غارت ہو ـــــ جو ہوگا سو میں خود دیکھ لوں گا۔ ہمیں تمھاری ضرورت نہیں۔"

"گھاس کھا گیا ہے مردُوے، تو جنائے گا؟" خلیفن غرّائیں۔

"تیری ایسی کی تیسی مُردار ـــــ چل نکل یہاں سے ـــــ" ممدّ میاں گرجے۔ مارے غصّے کے اُن کے آنسو بہنے لگے اور سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

"چل دور ہو موئے ـــــ" انھوں نے دھڑ سے دروازے بند کر لئے۔ اور ممدّ میاں سر پکڑ کر ہچکیوں سے روتے وہیں بیٹھ گئے۔ بچّے بھی رونے لگے۔

کپّی کی روشنی میں آنکھوں نے دیکھا، بچّی کی آنکھیں چڑھ گئیں، دانتیں بھچ گئی اور ہاتھ پاؤں مُڑ گئے۔

"ہائے میری بچّی ـــــ" وہ دھاروں دھار روتی ہوئی اُسے سنبھالنے لگی۔ اُن کی چیخ سُن کے ممدّ میاں نے دروازہ کوٹ ڈالا ـــــ بنّو سخت جان عورت کی ذات درد لے کر پھر سنبھل گئی۔ اور اُنھوں نے ممدّ میاں کی سات پُشتیں تو م ڈالیں۔ باسط خاں کے پُرکھوں کی قبریں کھود کر اُن کے سروں پر سے کفن کھسوٹ لئے۔ مائی تھان اور مائی تھان کے رہنے والوں حتیٰ کہ آگرے کے باسیوں تک کو نہ چھوڑا۔ وہ روتی جاتی تھیں۔ سوکھی ماری ٹنڈا سی لونڈیا دوہری ہوگئی۔

"نہ رو چندا ـــــ بس ـــــ ہاں ذرا پٹّی پکڑ لے میری بٹیا ـــــ ہاں میری لاڈو ـــــ اوپر سانس نہیں کھینچ ـــــ ہاں ـــــ بس نیچے ہی نیچے ـــــ

ان کے ہوتوں سوتوں کی میت جائے ــــــ دم گھونٹ کے ــــــ ہاں ــــــ ہاں ــــــ ہا ــــــ آ ــــــ آن ــــــ"

بچّے میں دم نہ تھا۔ جیسے چیتھڑے کا گڈا۔ خلیفن نے لوٹا پوٹا ــــــ پیروں سے جھلایا۔ دو چار تھپکیاں دیں۔

"چیں ــــــ" نئی زندگی پکاری اور مارے خوشی کے خلیفن کے دوگنے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹا ہے ماشاءاللہ ــــــ" دھڑ سے انھوں نے دروازہ کھول کر اعلان کیا۔ اُن کا مُنہ، ہاتھ اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ دوپٹہ غائب۔ گوشت کی لال بوٹی کی طرف انھوں نے پیار سے دیکھا۔ اور ممدّ میاں کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کواڑ بھیڑ دئے۔ ممدّ میاں کی مسکراہٹ ایک دم کے لئے لپکی اور پھر بُجھ گئی۔ خلیفن بھی کھسیانی رہ گئیں۔ مبارک باد کا بھلا کیا موقع تھا۔

"ایک پیالہ دودھ ہوگا؟" انھوں نے بچّے کو نہلانے کے بجائے اپنے برقعے سے پونچھ کر ممدّ میاں کی قمیص میں لپیٹ کر بنّو سے چھوٹے بھائی کو پکڑا دیا۔ بچّے چاروں طرف بیٹھ کر حیرت سے اس کیڑے کو دیکھنے لگے جو اُن کی چھوٹی آپو کے پیٹ سے نکلا تھا۔

بچّوں کو سُلا کر ممدّ میاں کی قمیص پہن کر اُنھوں نے ایک دُھلی ہوئی تہمد کا دوپٹہ بنا کر اوڑھ لیا۔ پیجامہ کا کیا ہے گھر جا کر بدل لیں گی۔ بوتہ باورچی خانہ تھا۔ جیسے کتّے کی کنڈیلی، نہ جانے کب سے ہانڈیاں پڑی سڑ رہی تھیں۔ مُمدّ میاں کی بہو کے سارے جہیز کے برتن لتھڑے پڑے تھے۔

واپسی سحری کے وقت سے پہلے نہ ہو سکی۔ راستے میں ممدّ میاں نے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگی۔ غلطی کچھ خلیفن کی بھی کم نہ تھی۔ ایسے موقعے پر خلیفہ ہوتے تو لگاتے دو۲ جوتیاں چوٹی پکڑ کے۔ بڑا تہا تھا مرنے والے کا۔

"مگر اِتنا پھر بھی کہوں گی ممدّ میاں تمھاری کمزوری ہے۔"

"کیا کروں کلّو کی ماں! ــــــ لونڈیا کا باپ ہونا بھی قیامت ہے۔"

"مرد ہو کے مجھ سے پوچھتے ہو؟ ــــــ وہ کوئی لاٹ کا بچہ ہی ہووے۔ میں تو چھاتی پر چڑھ کے لہو پی جاتی۔

اور سچ مچ خلیفن نے خون پی لینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ۔ جب بنّو میں ذرا دم آ گیا تو ایک دن وہ اپنی زرہ بکتر یعنی اپنا تازہ برقعہ نکال کر پہنچیں۔ محمدؐ میاں کے ہاں انھوں نے واجد میاں طولعمرہٗ یعنی بنّے کے لونڈے کو تیل مل کر نہلایا۔ یہ ڈھیر سا کاجل بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا۔ نظر گذر سے بچانے کو ایک ٹیکا دائیں پیر کے تلوے اور دائیں گال پر لگایا۔ سُرخ گرنٹ کا کُرتہ، جس میں پیلی مغزی لگی تھی۔ پہنا کر اودا ہری جھالر کا کنٹوپ پہنایا۔ موزے اُنھوں نے بساطی کی دوکان پر جاتے جاتے خرید لئے تھے۔ بنّو کو انھوں نے گلابی غرارہ کُرتا اور فیروزی چُنا ہوا دوپٹہ اُڑھایا۔ نگوڑی ابھی تھی کتنی جو برقعہ اوڑھتی، اُنھوں نے لمبی سی چادر سر سے پیر تک لپیٹ دی جو اُس کی موتیوں کی گرگابی تک پہنچ رہی تھی۔

اور یوں قافلہ چلا۔ آگے آگے فیلڈ مارشل یعنی خلیفن برقعے کا نقاب مُنہ پر منڈھے اُن کی کھونٹا سی ناک کتارہ بنی، گود میں واجد علی خاں ولد واحد علی خاں ولد باسط علی خاں، سپرنٹنڈنٹ ساکن مائی تھان، پیچھے اُن کے واجد علی خاں کی مختصر سی والدہ ماجدہ اور اُن کے پیچھے محلّے کے لونڈوں اور لینڈی کتّوں کی فوج۔ خلیفن نے حویلی پر چڑھائی کر دی۔

دربان " نا، نا " کرتا ہی رہ گیا۔ اور وہ ایک چھپاکے میں غڑاپ سے بنّو کا ہاتھ پکڑ کے اندر، دربان کتّوں اور گلی کے بچّوں سے جوجھتا رہ گیا۔ اندر سپرنٹنی برآمدے میں تخت پر بیٹھی تازہ اخبار " تہذیبِ نسواں " کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ صاف سُتھری چوکیوں پر چیتّی چاندنی کسی تھی جس پر گاؤ تکیہ اور گاؤ تکیے کی ہم شکل بیگم سجی ہوئی گوبھی کی کھیر کی پر غور کر رہی تھیں۔ لشکر دیکھ کر اُن کی جُٹی ہوئی بھنویں کھنکھجورہ بن گئیں۔

دندناتی آ تو گئیں خلیفن، پر ایک دم جی پر پولیس کی بیگم کی دہشت بیٹھ گئی۔ نقاب اُلٹ کر ہکلائیں " سلام —— بیگم صاحب —— اری بنّو، ساس کو سلام کر نگوڑی۔" انھوں نے سنبھل کر حکم دیا۔

سوکھا مارا زرد ہاتھ ماتھے پر لگا کر بنّو دوہری ہو گئی۔ چادر کے گھونگھٹ میں اُس کے لرزتے ہوئے آنسو جذب ہوتے رہے۔

" کیا ہے خلیفن ؟ " بیگم نے ترشی سے کہا۔ اُنھوں نے اُن سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تکئے

سے لگی، عینک اُتار کر گھورنے لگیں۔ مگر خلیفن قلعے کے اندر پہنچ کر شل ہو گئی تھیں۔ دھم سے بیٹھ گئیں۔

"ارے بیگم پوتا مبارک ہو۔" انھوں نے رنگ برنگی پوٹلی بیگم کی گود میں دھر دی، بیگم ایسی بدکیں جیسے کسی نے دہکتا انگارہ گود میں ڈال دیا ہو۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" انھوں نے جلدی سے پوٹلی اپنی گود سے الگ رکھ دی۔ "نکل جاؤ کم بختو........ سپرنٹنڈنٹ صاحب گھر پر نہیں ورنہ تھانے پہنچا دیتے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟........ بھاگ جاؤ تم لوگ .... ارے او مسیتا! ذرا دیکھ تو میاں پنڈت جی کی طرف ہوں گے۔ لپک کر بلا تو لا........"

"ہاں ہاں بلوا لو دادا جان کو بھی، پوتے کو دیکھ کر کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"بس بس زیادہ جبڑا نہ ہلاؤ خلیفن بُوا........ یہ بلا اُٹھاؤ اور باہر نکلو۔"

"اے ہے، اس ننھی سی جان کو بَلا کہہ رہی ہو، ذرا دیکھو تو بیگم۔ بالکل کھلونا ہے۔"

"ارے تو ہم کیا کریں........"

"ارے کلیجے سے لگاؤ اور کیا کرو........ اللہ نے یہ دن دکھایا۔"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ کہ بیگم صاحب، اتنی ننھی نہ بنو۔ غریب کی لونڈیا مٹی کی گڑیا نہیں کہ چار دن کھیل کے ٹھکرا دیا۔ ہاتھ پکڑا ہے تو صاحبزادے کو نبھانا ہوگا۔"

"مگر خلیفن........ واحد میاں نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا........ اللہ رکھے بی، اے کریں گے........ ولایت جائیں گے، تب شادی وادی بھی ہو ہوا جائے گی۔" جب تک سرکار نہ آئیں بیگم نے سوچا ذرا نرمی سے بات ہو جائے۔

"ہاں ہاں بیگم، میں یہ کب کہتی ہوں کہ میاں پڑھنا چھوڑ دیں........"

"اور پھر میں تو اپنی نند کو زبان دے چکی ہوں۔" انھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"نند کو زبان دے چکی تھیں بیگم تو لونڈے کو گلے میں رسی ڈال کے رکھا ہوتا، کہ بے نتھا بیل دوسروں کی کھیتیاں نہ کچلتا پھرے۔ نا بیوی، وہ زمانے لد گئے۔"

خلیفن پھر گرم ہوئیں۔ ایک دم بنّو پر برس پڑیں۔ "اری نامراد، کیا ٹسوے بہا رہی ہے۔ اُٹھ کے ساس کے پیر پکڑ لے۔" اور بنّو جیسے منتظر ہی تھی گرنے کی۔ تیورا کر بیگم کے قدموں

پر گر گئی۔ ننھے ننھے سوکھے مارے ہاتھوں سے موٹے چکنے پیر پکڑ کر ان پر ماتھا ٹکا دیا۔
بیگم کے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا تو بنو وہ جا کر سلفچی پر گری۔

"اے ہے جردا، تیرا دل ہے کہ موا پتھر، جو لونڈیا کے جگہ بہ جگہ چوٹ لگ جاتی تو۔؟"

"اری خیرن......... باقر......... اللہ دی۔ ذرا لینا اس حرام زادی کو۔ نکالو تو اُسے جوتیاں مار کے......"

"جوتیوں کی بچی! حرام زادی تو اور تیری سات پُشتیں۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی آئی کہیں سے۔ چونڈا پکڑ کے اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ باوا کا نام بھول جائے۔" شیرنی کی طرح خلیفن گرجیں۔ بنو اور اُس کا بچہ چلا چلا کر رونے لگے۔

"ارے یہ کیا قصہ ہے........؟" سپرنٹنڈنٹ صاحب گرجے۔ یہ ڈیل ڈول، یہ بڑی بڑی مہندی میں رچی ہوئی مونچھیں۔ گول انڈا سی توند، چست پاجامہ اور باریک لکھنؤ کی چکن کا کُرتا پہنے، شکاری ہیٹ گرمی سے بچنے کو لگا لیا تھا۔ عجیب تو تیچیوں کی سی شکل کے لگ رہے تھے۔ کبھی بڑے حسین ہوں گے۔ اب تو پھٹکار برسنے لگی تھی۔

"سلام میاں......" خلیفن پھر لچک گئیں۔

"سلام خلیفن بُوا...... کہو، اچھی تو رہیں؟" پولیس والے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔

"آپ کی دُعا ہے سرکار۔"

"بیگم کھانا تیار ہے؟" انھوں نے نرمی سے خلیفن کو ٹالنا چاہا۔ مہذب زبان میں اُس کا مطلب ہے، آپ تشریف لے جائیے کیونکہ کھاتے وقت صرف رزالے روٹی کے ٹکڑے کی آس میں ٹھہر جاتے ہیں۔ مگر خلیفن کو کون ٹال سکتا تھا۔

"اے قربان جاؤں سرکار کے، کیا دادا جان کو مُڑ مُڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ واجد میاں آنکھیں تو سرکار بالکل آپ جیسی نرگسی ہیں۔"

"بیگم، یہ کیا بکواس ہے......" باسط میاں کے ہاتھ کی لرزش چھپائے نہ چھپی۔

"مجھ سے پوچھیے سرکار........ یہ بنّو آپ کی بہو........ ممدّ میاں کی لونڈیا........ واحد میاں........"

"خاموش ...... بدتمیز........ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"سرکار، سارا محلہ گواہ ہے، آپ کے ڈر سے کوئی بولتا نہیں۔"

"محلہ گواہ ہے؟ ...... سچّی بات ہوتی تو سب ہی کہتے، کیا میں نے اُن کا منھ بند کیا ہے؟"

"سرکار، آپ سے کوئی بھید نہیں چھُپا........ یہ واحد میاں کا ہے........ صورت دیکھیے یہ پٹھانی آنکھیں کہاں چھُپیں گی، ابھی سے پولیس والوں کی طرح اکڑے ہے۔" انھوں نے بچّے کو باہنوں میں جھُلا کر کہا۔ سرکار رحم کیجیے اس ننّھی سی بچّی پر سوچیے میاں، اس کا کیا ہوگا..... اِسے کون قبول کرے گا...... ممدّ میاں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا......"

"اوّل تو تم بکتی ہو، واحد میاں ایسے گئے گذرے بھی نہیں کہ موریوں میں ناک ڈالتے پھریں۔ دوسرے وہ ابھی پڑھ رہے ہیں۔ اند ھیر ان کی عمر ہی کیا ہے۔"

"پڑھنے کو کون روکتا ہے میاں۔ جم جم پڑھیں۔ اور میاں بچہ پیدا کروانے کے لائق ہیں کہنے کو ابھی جھنڈولے ہی ہیں۔"

"بکواس مت کر......" سولہ سترہ برس کے واحد خاں اوپر روشن دان سے آنسو بھری آنکھوں سے یہ ڈرامہ دیکھ دیکھ کانپ رہے تھے۔

"میاں ذرا سوچیے۔ آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ اس کی عزّت رہ جائے گی۔ آپ کے عروج کو دُعائیں دے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ دو روٹیاں تو آپ کے کتّے بھی کھا لیتے ہیں۔" انھوں نے لرزتی ہوئی بنّو کا گھونگھٹ سرکا دیا۔ اس کی صورت دیکھیے سرکار۔"

"ہم اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں خلیفن۔" سوکھی ماری بنّو کی طرف آنکھ اُٹھانے کی اُن کی ہمت نہ ہوئی۔

"تو سرکار، شروع میں تو چار کی اجازت ہے........ واحد میاں شوق سے پھوپی کی بیٹی بیاہ لائیں۔"

مگر اب باسط خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ پرانی تھانے داری کی رگ اُبھر آئی۔ انھوں نے نوکروں سے کہا۔ "دھکّے دے کر نکال دو سالی کو۔"

بس گالی کا سُننا تھا کہ خلیفن جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

"تیری ایسی کی تیسی حرام خور دغا باز۔" اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، گریبان پکڑ کر چپٹی جوتی اُتار تڑ تڑ چار پانچ رکھ ہی دیں۔ باسط خاں نے جھنجھلائے ہوئے ریچھ کی طرح اُنھیں جھٹکا مگر اُنھوں نے باؤلی کُتیا کی طرح دانت گڑو دیے، کرتا جھیر جھیر کر ڈالا۔ مونچھیں کھسوٹ ڈالیں۔ ایسی مردمار تو کبھی نہ تھیں۔ پر آج اُن پر جانو مرگھٹ کی بُھتنی سوار ہو گئی تھی۔

ہونا کیا تھا۔ دھکّے دے کر حویلی سے نکال دی گئیں۔ بچّے کی پوٹلی دبائے وہ لمبے لمبے ہاتھ چلا کر باسط خاں اور ساری پولیس فورس کو مغلّظات سُنا رہی تھیں۔

"اے محلہ والو! ڈوب مرو........ ارے یہ سپوونٹ ہے کہ شیطان...... اس کا لونڈا پرائی بچیوں کی عزّت مٹّی میں ملائے ...... انھیں پیٹ رکھائے۔ ...... اور تم ہیجڑوں کی اولاد کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے ...... ارے ایک دن تم سب کی جوروئیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں بھگائے گا۔" انھوں نے کھڑکیوں، دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "ہے، ہے۔ چوڑیاں پہن کے گھروں میں گھس جاؤ، بیوی کے لہنگے تلے۔" انھوں نے لالہ جی کو دروازے کی آڑ سے چوہے کی طرح جھانکتے دیکھ کر پکارا، بے چارے نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

ممدّ میاں گھر میں سر پکڑے بیٹھے تھے، خلیفن نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا۔ محلے میں سر اُٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہنکارتی ہوئی جب وہ بچّے اور بنّو کو لے کر پہنچیں تو اُن کے پیچھے لونڈوں کی ڈھیری لگی ہوئی تھی۔ بچّے اُنھیں ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ پورس کی طرح سکندر اعظم کے دربار میں مُنہ توڑ جواب دے کر آئی ہوں۔ "ارے خلیفن بُوا کی ہمت تو دیکھو۔ سپوڈنٹ صاحب کی مونچھیں اُکھاڑ ڈالیں۔" مگر ممدّ میاں کا جی چاہ رہا تھا کہ خلیفن کو چاب کر تھوک دیں موری میں۔ مگر اس سے پہلے کہ ممدّ میاں اُن پر حملہ کرتے، وہ بپھری شیرنی کی طرح اُنھیں پر برس پڑیں، برقعہ اتار کر اُنھوں نے اُن کے مُنہ پر دے مارا۔ "لو .... یہ برقعہ پہن کر نکلا کیجیے۔"

"بس خلیفن، بہت ہولیا۔ لے اب سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ میری زندگی میں ویسے کون سی بہاریں تھیں جو اور تم نے کانٹے بو دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے خالہ جی کا داماد نہیں۔ کوئی اڑنگا لگا کر چکی پسوا دے گا اور میری ٹال میں آگ لگا دے گا سو الگ۔ نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی جو تم سے پالا پڑا....... اس سے تو یہ بے حیا رنڈی مرگئی ہوتی۔" انھوں نے بنّو کو ایسا رہپٹ لگایا کہ وہ جا کے گری اوندھے منہ۔

"خبردار جو تم نے لونڈیا پہ ہاتھ اٹھایا۔ مارنا ہے تو مجھے مار بنّو کے باپ..... تصور میرا ہے........ آگ لگے میری زبان کو........ میں نے لونڈیا کے بھلے کو یہ فضیحتا مول لیا۔" انھوں نے بچہ بنّو کی گود میں دے دیا اور پٹی پٹائی شکل لئے چل پڑیں اپنے اجاڑ گھر کی طرف۔

سارا دن خلیفن روزے میں تھکی ہاری کھرّی چارپائی پر پڑی دھاروں دھار رویا کیں۔ انھیں افطار کی بھی فکر نہ تھی۔ وہ سچ مچ جلتا توا تھیں۔ بس کی گانٹھ جس چیز میں ہاتھ ڈال دیں اس کا کباڑا ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو ہونا تھا ہو چکا چپ چاپ بنّو کو کوئی بڈھا ٹھڈا دوہاجو مل ہی جاتا۔ مگر اب جو یہ تھبڑی پٹ گئی تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔ پھر پولیس والے ہوتے ہیں ذرا بسیلے، بچھو باسط خاں کے ڈنک سے بچنا مشکل ہے۔
آج خلیفن کو اپنے نکمے پن کا یقین ہو گیا۔ اسی زبان کی خاطر بہو داماد سے نہ بنی۔

عصر کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھیں کہ آہستہ سے کنڈی کھڑکی "یا علی.... یا پیر دستگیر..... اے مولا، بارہ اماموں کا صدقہ، پولیس چوکی کا آدمی نہ ہو۔ اے خدا رحم......" کانپتے لرزتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی۔ تو کوئی نظر نہ آیا — اطمینان کا سانس لے کر بند ہی کرنے والی تھیں کہ واحد میاں بھیگی بلی بنے دیوار کے پاس سُکڑے نظر آئے۔

"الٰہی خیر!" بوا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"کیا کام لڑکے؟" رکھائی سے بولیں۔

واحد میاں نے کٹی ہوئی گائے کی طرح ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔

"اندر آجاؤ بیٹا!" بوا ایک دم سے نرم پڑ گئیں۔

واحد خاں پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے بیٹھ گئے۔ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولنا چاہا مگر گلے میں آواز گھٹ گئی۔ آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو نکل پڑے۔

"مرد بچّے ہو کر روتے ہو۔ اس بدبخت کا تو خیال کرو۔ ذرا سی بچّی پر کیا بیت گئی۔ میرا تو کلیجہ شق ہوا جائے ہے۔ کچّی عمر کے چاپے میں اس ننھی سی کلی پہ کیا گذری ہو گی۔۔ بڑے ہو جاؤ گے تب پتہ چلے گا۔ میاں تمھارا کیا بگڑا، ماشاءاللہ بی آ، ایما پاس کرو گے، لندھن جاؤ گے۔ دولھا بنے گھوڑی پر نواب زادی بیاہ لاؤ گے۔"

"نہیں بُوا......... میں سنکھیا کھا لوں گا" واحد میاں کی ہچکی بندھ گئی۔

"تُف ہے تمھاری اوقات پہ....... تم مزے سے قبر میں جا لیٹو گے اور وہ تمھارا گناہ چھاتی سے لگائے گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ کیا پھول سا ہے واجد...... باپ کی شکل ہے ماشاءاللہ" واحد کے کان سُرخ ہو گئے۔ کم سن باپ جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ نامعلوم سے غرور سے مسکرا پڑا۔ مگر دوسرے لمحے پھر ہونٹ کانپنے لگے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا...... بوا کو تو فرصت نہ تھی۔ اپنے ہی آنسوؤں سے۔ محلّے میں افراتفری پڑ گئی۔ سُنا مائی تھان میں مسجد کے سامنے پولیس کی چوکی لگ گئی۔ محلے کے شہدوں نے سپرنٹنڈنٹ کا مکان جلانے کی کوشش کی۔ مسجد میں بعد نماز مغرب بڑی ہڑ بونگ مچی۔ مُلّاجی تو فتویٰ دیتے تھے کہ دونوں کو سنگسار کر دینا چاہیئے۔ شرع شریف کا یہی حکم ہے پر محلّے کے نوجوانوں نے ہُلّڑ مچا دیا۔ ان چھوکروں کو تو بس دنگے فساد کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے۔ ذرا سی بات پر لال جھنڈیاں لے کر طوفان مچانے لگتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں باسط خاں کا پتلا بنا کر چوراہے پر جلا دیا گیا۔ کسی سرپھرے نے رائے دی کیوں نہ حویلی کو ہی پھونک دیا جائے۔ بات بڑھی، پولیس آگئی۔ لاٹھی چارج ہوتے ہوتے بچا۔ بات اوپر تک پہنچ گئی۔ دو چار اخباروں نے بھی اس لطیفے سے فائدہ اٹھایا اور نہایت سنگین قسم کے کارٹون نکل گئے۔ پیر کو افطار سے پہلے ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب ممدّ خاں کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹانے پہنچ گئے۔

"خلیفن جانیں، میں کچھ نہیں جانتا..... ممدخاں نے صاف کہہ دیا۔ اور دروازے میں بوکھلائی برقعے کا پرچم اُڑاتی، بیگم بھی اتنے میں پہنچ گئی تھیں۔

"ممدّ بھائی جو ہونا تھا ہوگیا، قاضی صاحب تشریف لارہے ہیں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیئے۔" بیگم کھمبے کی آڑ میں کہہ رہی تھیں۔

"میں نے کہہ دیا کہ خلیفن جانیں...... میں کون ہوتا ہوں بیچ میں بولنے والا۔" خلیفن نے جاتے ہی مورچہ سنبھال لیا۔ جھٹ سے چارپائی پر دری اور چادر بچھائی، ایک ٹین کی کرسی باسط خاں کی طرف بڑھائی۔

"ہاں صاحب، دیر کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی دم میں قاضی صاحب آتے ہوں گے۔"

"ارے نیک بخت، کچھ شربت وربت کا تو انتظام کرو۔" انھوں نے ممدّ میاں کو ڈانٹا۔ نکاح کے بعد سب محلّے کے معززین نے مل کر روزہ افطار کیا۔ محلّے کے وہی لفنگے جو گھڑی بھر پہلے باسط خاں کی ارتھی جلا رہے تھے، "باسط خاں زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے ــــ باسط خاں کو صرف ایک شکایت تھی کہ پوتے کا نام خلیفن نے بدذاتی میں واجد خاں، اُن کے اپنے باپ کے نام پر رکھا۔ حالانکہ واحد میاں کے بیٹے کا نام ساجد عرصہ ہوا طے پا چکا تھا۔ خیر اب انشاء اللہ عقیقہ پر ساجد ہی نام رکھا جائے گا۔

خلیفن دانت نکوسے لپ جھپ سب کی خاطریں کر رہی تھیں، دوڑ دوڑ کر سب کو شربت کے گلاس بانٹ رہی تھیں۔ گلی میں بدمعاش لونڈے شربت کی کٹوریاں پی پی کر نعرے لگا رہے تھے۔ "خلیفن زندہ باد۔"

"اے چُپ رہو حرام خورو!" خلیفن شرما شرما کر اُنھیں کھجوریں اور نان خطائیاں بانٹ رہی تھیں۔

پھر ایک معرکہ ممدّ میاں نے خلیفن کی چوکھٹ پر سر کیا۔ جا کر انھوں نے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ اور بالکل جیسے کوئی پڑوسن سے نون مانگے۔ خلیفن کی خدمت میں نکاح کا پیغام پیش کر دیا۔ پہلے تو مُنہ پھاڑے خلیفن بھونچکی سی رہ گئیں۔ پھر جو بپھری ہیں تو خدا کی پناہ!

"حرام زادے، کلموہے، چرکٹے، چیرّقناتی...... اے تجھے ڈھائی گھڑی

کی آئے ــــ تجھے طاعون سمیٹے، تیری میّت اُٹھے ــــ" پھر جو جوتی لے کر پلی ہیں ممدّ میاں پہ تو پلیتن نکال دیا۔ مگر ممدّ میاں درِ محبوب پر گردن کٹانے کا تہیہ کر کے آئے تھے، جوتیوں اور گالیوں کی پھوار کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئے۔ وہ جوتیاں برسا رہی ہیں۔ ممدّ میاں کہنیوں سے وار روکتے جا رہے ہیں اور اظہار عشق بھی کرتے جا رہے ہیں۔

"اری سُن تو نیک بخت ــــ اری ــــ خلیفن ــــ تجھے ــــ میری قسم ــــ میری بات تو سُن ــــ رات کو ــــ نیند نہیں آتی ــــ"

"اے تو جا، قبر میں موئے ــــ تجھے ہیضہ لے جائے۔"

"نکاح کر رہا ہوں ــــ کوئی بُری نظر نہیں ڈالی۔"

"اے ہے اُٹھائی گیرے ــــ ڈھونگی ــــ تو بُری نظر ڈالے گا تیرے دیدے نہ پھوٹیں گی ــــ میری محبت کا تو نے یہ پھل دیا ہے ــــ کمینے ــــ نکل ــــ نکل میرے گھر سے۔"

"بس جی بس ــــ بڑھتی ہی چلی جاتی ہو۔" ممدّ میاں نے ہاتھ مروڑ کر جوتی چھین کر الگ پھینکی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟ ــــ قصور تو میرا ہے ــــ بدمعاش، کہ تیرے لئے محلے بھر سے جھگڑا کیا۔ تیرے بچوں کو اپنا سمجھا۔" خلیفن کا گلا بھر آیا۔

"تو جب اپنا سمجھا ہے تو چل کے سنبھالو کم بختوں کو ــــ ممدّ میاں گھگھیائے۔

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ــــ میں تیرے بچوں کی لونڈی ہوں موئے ــــ چل دور ہو ــــ" وہ دور ہٹیں۔

"لونڈی ہو کہ بیگم ــــ اب تو تم ہی سب کچھ ہو ــــ ممدّ میاں اُن کی طرف کھسکے۔

"ارے جا، جا ــــ گھاس گیا ہے ــــ خبردار جو تو نے ایک قدم بھی بڑھایا ــــ" وہ پیچھے ہٹیں، مگر ممدّ میاں بڑھتے ہی چلے گئے۔

"موئے جاتا ہے کہ نہیں ــــ" خلیفن سہم کر دیوار سے چپک گئیں۔

"نہیں خلیفن جی! ____ جی کرے تو مار ڈال ____ پر اللہ قسم اب صبر نہیں ہوتا۔" ٹھنڈی آہ بھر کے ممدّ میاں بالکل ہی سٹ گئے۔

"ہے ہے موئے ____ بے شرم ____" خلیفن کی آواز گھٹ گئی۔

"دل پر قابو نہیں خلیفن ____ قرآن قسم ____" اور ممدّ میاں نے لالٹین کی بتّی تیل میں اُتار کر بُجھادی۔

رات کے دو بجے مسجد سے نکاح کر کے نکلے اور ممدّ میاں خلیفن کو اکّے پر بٹھا کر لے چلے تو اُن کے دانت مونچھوں میں بکھرے جارہے تھے۔ جیسے وہ نئی دُلہن بیاہ کر لے جارہے ہوں۔ خلیفن بھی کنواری لونڈیا کی طرح کانپ رہی تھیں۔

"سچ بتاؤں خلیفن ____ جب پہلے دن بنّو کی زچگی میں تم نے مجھے گالیاں دی تھیں، میں نے فیصلہ کر لیا تھا ____ پر تم بھی تو مجھے چاہنے لگی تھیں۔"

"اے ہے توبہ! خدا نہ کرے۔" خلیفن بھنّائیں۔

"اب ہم سے جھوٹ نہ بولو۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ بھلا تمھاری نیت صاف ہوتی تو میرے دل میں میل کیوں آتا؟" ممدّ میاں نے جرح کی۔ خلیفن بوکھلا گئیں۔

"تجھ پر خدا کی سنوار ____" انھوں نے حلق میں موٹی سی گالی دبا کر کہا۔ اگر قسمت نے ممدّ میاں کو اُن کا خدائے مجازی نہ بنا دیا ہوتا تو وہ اُن کی سات پشتوں کو مزے سے بیٖنتیں۔

"میں تو بچّوں کی وجہ سے ____" وہ چُپ ہو گئیں۔

"بچّوں کی اِتنی فکر ہے ظالم! اور بچّوں کا باپ آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔" مُمدّ میاں نے کہنی سے خلیفن کا گھٹنا دبا کر کہا۔

"دُنیا کیا کہے گی؟"

"ارے گولی مارو سالی دُنیا کو۔" مُمدّ میاں نے چابک پھٹکارا۔ اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

سُنا ہے بہت ڈن سے تعلق تھا" وہاب چچا کی دولہن نے گیر بدل کر لونڈے کو

ایک گھنٹے سے دوسرے پر کھسکا۔

"اے ہوگا، ہماری بلا سے"۔ بیوی نے اُکتا کر پان کی کتر توڑی اور کتھا چونا لگانے لگیں۔

دور گلی میں کوئی آوارہ چھوکرا گاتا پنجہ شاہی کی طرف جا رہا تھا۔ "عشق پر زور نہیں ______"

اور خلیفن ڈھیر سارے جھوٹے برتن سامنے رکھے جھما جھم مانجھ رہی تھیں۔ دو سیر آٹا گوندھنے سے مونڈھوں پر میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ ممدّ میاں حقّہ پیتے میں مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرائے تھے، اُن کی آنکھوں میں گستاخ شرارت تھی۔

رات کو جب ممدّ میاں اپنا بھاری سیاہ ہاتھ اُن کے دل پر رکھ کر غافل سو رہے تھے تو خلیفن جاگ رہی تھیں۔ جازم کے پیچھے سوئے بچّوں کی میٹھی سانسیں اُن کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ اُنھیں ایسا معلوم ہوا۔ وہ بڑے شربتی چھتنار درخت کے شربتی سائے میں لیٹی ہیں اور اُن کی گود میں میٹھے میٹھے پھل برس رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر

جلا وطن

سندر لالہ۔ سجے دُلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے۔

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے سُرخ گموں والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ چبوترے کی طرف سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی —— بندگی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھسی ہو بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا —— مجھے کیا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے۔" انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھیّن صاحب ناج پھٹک رہی تھی۔"

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہئے۔ چل ہٹا سب چیز ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تولے ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر بیٹھ کر انہوں نے اپنی بہن کو آواز دی۔

"چھوڑا ہے اب تلک مورا بھیتجا۔۔۔ جی ای ای۔۔۔ جی ای ای۔۔۔ بھیجی" (ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اُداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوے کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے۔۔۔ "ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے کر رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں بھیتن۔۔۔" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلّے کے گودام میں سے باہر آ کر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلّو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آگئیں۔

"جے رام جی کی بھیتن صاحب۔۔۔" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی۔

"کٹھل کی ترکاری کھیئو بھیتن صاحب۔۔۔؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور کھیبا بھائی"۔ ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں اور گول پتھر سالگرام سے لے کر بجرنگ بلی مہراج تک سیندور سے لپی پُتی گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی پکّی رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ ابھی سریّن رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیما کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا۔ (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کردے گی) یہاں ہر بالآخر امن تھا۔۔۔ اور سکون۔

اب کھیم نیچے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اُس نے کروندے اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی مُنہ میں ٹھونسے تھے، "دھاکر دادھی ناکت نا۔۔۔ دھاوا کروا۔۔۔ ارے باپ رے۔" اس نے مُنڈیر پر سے اوپر جھانک کر و مینتی سے کہا۔۔۔ "ماما آئے ہیں۔

بھاگ جا۔ ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے —— " ومینتی بھاگ گئی۔

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے، کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کھیم وتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

" نمستے ماما —— ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منھ ہاتھ دھو آؤں "۔

" چل چڑیل —— بہانے باز —— سبق سُنا پہلے —— " ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انھیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبہ برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے) " تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا۔" انہوں نے پھر بزرگ بننے کی سعی کی۔

" ارے باپ رے !! —— " کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

" اور تو نے چوڑیاں تو بہت خوبصورت خریدی ہیں ری "۔

" ہی ہی ہی —— ماما —— " کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

" اور تو ساری پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی —— باؤلی سی —— " انھوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا۔)

" جی ماما —— "، کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جون پور کے اس ٹھیٹھ دقیانوسی سریواستو گھرانے کی بیٹیا —— پر ان کا بیاہ ہوا تھا الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چاء پانی پیتے تھے۔ ودھوا ہوئے اب ان کو سات برس ہونے کو آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں لیکن محلے پر ان کا رعب تھا کیونکہ وہ الہ آباد

رائے زادوں کی بہو تھیں ـــــــ دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول اسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اُجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، زرا پیچھے ان کی بی بی سرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ افوہ۔ کیا ٹھکانا تھا بھلا بس ہر بنگالی کے گھرانے میں لڑکیوں کی یہ فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونديرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونديرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالا نے نہ کر ڈالے ـــــــ "نل دمینتی" ـــــــ اور "شکنتلا ہریش چند" اور "راج رانی میرا" ـــــــ اور اوپر سے ڈانس الگ ـــــــ گریا بھی ہو رہا ہے کہ "آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نندلال ـــــــ" اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ـــــــ جی ہاں ـــــــ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھیاری چلو پنگھٹ بھروا پانی ـــــــ اور ساتھ ساتھ مونديرا سین۔ گپتا ہے کہ فرّاٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔ ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول۔ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں ـــــــ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا۔ اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سری آوازوں میں پڑھ دیا۔

"تم ہی فخرِ انبیاء ہو۔ یا نبیؐ سلام علیک ...." چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی ـــــــ اور روزنامہ "صدائے حق" نے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں شائع کیا۔

"ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔"

"مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا —— بناتِ اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم —— اسکول کو بند کرو ——" (یہ سب قصے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اُسے سُنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی) صدر اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی۔اے۔وی۔ کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری —— ایف۔اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آرہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ —— ؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا۔ جس کا جواب دینے کے لئے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اُسے کافی انفرمیشن حاصل تھی لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کرسکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سنیما تھے اور دس سنیماؤں کا ایک سنیما تو خود مہیلا ودیالہ تھا۔ جہاں اُسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پر وہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لیے بندھواتی تھیں۔ اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا ایسے سر پر جو موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلّے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونی ورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کے مربّہ تھے کھیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا۔ اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یوں ہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری تھی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔

اس کے بے شمار رشتے کے بھائی تھے ۔ اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا دیں ۔ (نوٹنکی کے دنوں میں رسوئیا تک لہک لہک کر گاتا ــــ اب یہی ہے میں نے ٹھانی ــــ لاؤں گا نوٹن کی رانی) ــــ کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لیے لکھنؤ سے چوڑیاں لیے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری اُن کے لئے جھپا چھپ پُل اوور بن رہی ہے ۔ اشفاق بھائی ہیں۔ تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پُل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی ۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لیے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے ۔ رہنے والے ان کے بھیتن صاحب جون پور ہی کے تھے ۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ ”ضلع کے رؤسا اور مقامی عائدینِ شہر“ میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے ان معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے ان کی کبھی نہ بنی ۔ انٹلکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی ۔سی ۔ ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی، اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئن وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کھیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا، اور ہر مسلمان کے اپنے دسیوں مشغلے تھے ۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے ۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھیے تو کچھ نہ تھے یا شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے ۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سُنا گیا ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سُنادیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی، اُنہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے، اسکول کھلواتے۔ مشاعرے اور دنگل کرواتے تھے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی اُن ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا مشاعرہ تقریباً ایک تھا۔ وہی تیج تہوار، میلے ٹھیلے۔ محرّم۔ رام لیلا۔ پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار۔ سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق ودق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اُداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچّے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں، آوٹ ڈور، مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکّوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دُھندلی آنکھوں سے راہ گیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے گمّوں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے۔ حکیم مارکہ دھاگہ خرید یے۔ پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو۔ چائے جا کر ماں کو دو ــــ آ گیا۔ آ گیا۔ آ گیا ــــ سالِ رواں کا سنسنی خیز فلم "لہری راجہ آ گیا" جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے۔

پھر سایہ دار درختوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مؤدب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لاکر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کی پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

۲

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین۔ آئی۔ سی۔ ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج از ابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیندر بلا کھیلتی تھی، کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم۔ ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس کنزی دو۔ اور اے۔ پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی سالفرڈ جو چین چینا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاّتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اویونک کنزی تھی جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکّام کے ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وے مسٹر سکسینہ اور وے مسٹر فرحت علی اور وے مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک سیانے بھائی لوگوں کو تنگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقی ماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضایقہ ہے۔ جون پور ایسی ڈل جگہ پر مس ملک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیّرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں اُن کا تو نام سُن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ بے چاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں۔ لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھیے گائے جی ہاں۔ اب یہ دوسری کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمایل مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیّا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیّرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے

سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں، اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو اِن دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھر تھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آیندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی ——— آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکٹی وٹی ہو گئی۔

تو غرض کہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا۔

اور نئے حاکم، ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جون پور نے (کہ یہ سارے کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیٰحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے۔ (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانا کہلاتا تھا) کہا۔ آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اُتر والو۔ مہریوں سے کہا جاتا، ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتا دیتی آنا۔ ری رام رکھی جھاڑو پیٹی۔

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی دعوت میں آ گئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے کے لئے عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم

ہے ۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں ۔ ناک کی کیل گئی تو چولھے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی ۔

"اے لو بیٹا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر اُس سے کہا ۔

" اے ہاں سچ تو ہے ۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لیے بیٹھی ہو ۔ دو پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے !" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا ۔

کھیم کی تو بہر حال آج عید تھی ۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساڑی باندھی تھی ۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے ۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چھپکا تو ـــــ کشوری بھی پہن آئی تھی لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں ۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں ۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں ۔ کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی ـــــ کتنی سندر ہے اور بھرا ایم ۔ اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی ۔

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں ۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے ، دسیوں تھیں ۔ مثلاً موٹی مصراتی کی چال ہی دیکھ لو ۔ اور اوپر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں ،" تو ان کے حلق میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو ۔

اب کے سے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گذار کر دی ۔ کنول کماری ایسی ۔ اور کنول کمار ویسی ۔ ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے ۔

۳

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آ کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم اب نکلتا جا رہا تھا اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پُروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکراین والی بگیا والی گلی کے برابر مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا اس کے بعد بازار تھا، جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی کوٹھی تھی جس میں یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے پانچ سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کلی تھی۔ اُداسی اور ذلت تھی اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یوں ہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دُنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلی جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، مولسری کے جُھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی رائے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ——؟ لاحول ولاقوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا۔ ”آفتاب بہادر، تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔

جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔

"تم کہاں چلی جاؤ گی؟"

"افوہ ــــ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ــــ؟"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لوگی۔"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس۔ میرا بیاہ کردیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ــــ" آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ــــ "میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے۔"

"ہاں ــــ بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ــــ" وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے، یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے۔ پی۔ سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونی ورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا، وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہوگئے اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہوگیا ہے، منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا۔)

"استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔"

"بی۔ اے کے بعد تم کیا کروگی ــــ؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ـــــ" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بناؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل گئے۔ کیونکہ غالباً ان کی زندگی ان کے لئے، ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر ان کی آئیڈیالوجی تھی (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)۔

پر ایک روز لندن میں، جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی طرف جا رہے تھے تو راہ میں انہیں مہی پال نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی ـــــ

"چائے پیتے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا وہی جو سن پینٹس کے بیچ کا ہے ـــــ"

لڑکیوں کی عجیب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے۔

"ان کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں جو بڑی انٹلکچوئیل کی سانس بنی پھرتی تھی ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ گلیڈ ـــــ جگن ناتھ جین مائی فٹ ـــــ کون تھا یہ اُلو۔ میں نے کبھی دیکھا ہے ـــــ؟" مہی پال کے کمرے میں پہنچ کر آتش دان سُلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہی پال رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کو کئی دن گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا۔ زندگی بہت اُداس ہے اُس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا۔

"میں نے اُسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جُلتی اُس کی شکل ہے۔"

"بے وقوف بھی ہے ـــــ؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بے وقوف ہے۔" مہی پال رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"ـــــ پھر کنول اس کے ساتھ کیسے خوش رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے مہی پال سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ـــــ" مہی پال نے مُڑ کر ان کو مخاطب کیا۔ "یہ جتنی لڑکیاں

ہیں ـــــ جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں۔ آیا عقل میں تمھاری؟"

"کیا بکواس ہے؟" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہی پال رائے زادہ کو صحیح معنوں میں غصّہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اُس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آکر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر، میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آجاتی۔ میاں لڑکی تھی، یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو۔ جھاڑو لے کر ـــــ کیا کرتی ـــــ؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا۔ خیر چلو ـــــ خیریت گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بے کار میں۔ کیوں کہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے ایک سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں ـــــ تم کو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافعِ بلیّات ثابت ہوا۔"

"بے ہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ـــــ" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے۔ پی۔ سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا تھا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب لوں نہیں آئے ـــــ کیسی چوک بھئی موسے آلی ـــــ پھر ارچنا بنرجی آجاتی اور کوئل ایسی آواز میں گاتی ـــــ آلی پو ہوری جھورنا ٹکر ٹکر یو جوے ہو۔ اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سمے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیفٹ ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انھوں نے دیکھا۔ وہ کار سے اُتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی طرف جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی اور آلتا اُس کے پیروں میں (اکیلی ری سائیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار۔ وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا۔)

اب آفتاب رائے یونی ورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے یساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز اور باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ـــــ او، پرنس ارجن۔ ـــــ د "ارے جا ـــــ" عسکری ڈانٹ بتاتا اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی۔ پی مکر جی کی طرح گرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے۔" مہی پال اضافہ کرتا)۔

جون پور آکر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوئیاں آن آن گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باؤلی ـــــ بتا تو کیا کرنے والی ہے ـــــ" وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ـــــ" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

پتہ نہیں کی بچّی ـــــ وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی اور مسلمانوں کے محلّوں کی طرف محرم کے نقّاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آ گیا ـــــ آفتاب رائے کو خیال آیا ـــــ شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے، وہاں مسلمان حاکموں

کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۴ فی صدی حصّہ مسلمان تھے لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جون پور، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ، بریلی، مرادآباد، شاہ جہاں پور وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور باقی کے سارے خطّوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی، محلّے محلّے، گاؤں گاؤں سیکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں چپّے چپّے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی فرق نہ تھا۔ خصوصًا دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پاجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں کی بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے یہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دل چسپ تھی۔ پولیس کا عملہ اسّی فیصدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کرنے نہ دکھی تھی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل میں ہی مارے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا، انہیں قرضے چکانے تھے۔ بیٹا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانیے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچّے برسات کی دعا مانگنے کے لیے مُنہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلّاتے ——— برسو رام دھڑاکے سے۔ بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ——— ہاتھی گھوڑا پالکی ——— جے کنہیا لال کی۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک الاپتیں۔ پھر گگری موری ڈھرکائی شام ——— کرشن کنہیّا کے اس تصوّر سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری

اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا، ایک مکمّل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقا نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرہویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ——— لیکن ذہن ہی کو مکمّل سکون کہاں میسر تھا۔ پہلے یہ کنول کماری کو دے پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لکچررشپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اور ہندستانی کے گن گائے جاتے ——— یہ میں تم سے کہتا ہوں ——— کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک کانفرنس کے پنڈال میں چلّا کر کہا تھا ———

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں اُنہیں جون پور کا قاضی کہا کرتے تھے۔

"یہ جو کتاب جو تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ——— جون پور کا قاضی، عرف میں شہر کے اندیشے سے دُبلا کیوں ہوا ———؟"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتّے بڑے پُراسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی۔

محلّے کے مکانوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا، اس کی روشنی رات کے ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہوے کے جنگل میں اگیا بھتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بُکا کی مدھم آوازیں پُروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں نکڑ پر کنور نرنجن داس کے ہاں محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

۴

"عاشور کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھ"— بوا مدّن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔

"— ارے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا—" بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں— اے بیوی چاندرات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں—!"

بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ۔ توبہ..... کمبخت ایسی سارٹستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا— میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا— اے بہن— اے نیازی بیگم— ذری اپنی عینک تو دینا—" بُوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اُتار کے دی جو بُوا مدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بُوا مدّن نجم الملّت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں—؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھیے— بڑی بھاوج— نجم الملّت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتی ہیں۔" بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بیٹا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں—" بُوا مدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بُوا مدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔

کنبے اور محلّے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بُوا مدّن کے اس طعنے کا انہوں نے قطعی

نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اُتروالو ——" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کرلو —— کہار اندر آتے ہیں ——

فیرینی کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکاکر مولہ تیز آواز میں چلائی ——

"چھمّو بیگم آگئیں"۔

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں۔ اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادہ سے آگے بڑھیں۔

"اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیّا سی آتی رہتی ہے"۔

انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں مولہ نے یہ سن لیا" اے چھمّو بیگم —— ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجیئے۔ بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیّا آوے۔ شیطان کے کان بہرے —— ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں ساری گلی کو لے کر نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اِتنا اِتنا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

"اے بی مولہ —— ذری آپے میں رہنا —— میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ —— مجلس پڑھ جاؤ —— میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو ——" چھمّو بیگم نے بیچ آنگن میں کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں —— "اے ہے —— یہ کیا کوا نوچن مچی ہے —— اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو۔ چل نکل مولہ یہاں سے —— ڈو بی جب دیکھو یہی فضیحتا شروع کرتی ہے —— آؤ چھمّو بیگم جم جم آؤ ——"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا —— "اجی پیسے تو بھجوایئے بیگم صاحب ——"

"ارے دیّارے —— ساری دیہہ دُکھن لاگت ہے ——"، رام بھروسے نے

دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سُلگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور ریڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ ایک ریڑ وہ ایک طرح کا کرسی نما ٹھیلا ہوتا تھا۔ جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں، گھُس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے ڈھکیلا جاتا تھا اور چرخ چوں کرتا ریڑوہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا ــــ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیوٹ پالکی جو پہلے صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بوا مدن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھندنے لگاتی بوا مدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور توتے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں یہ رام پور کی میراثن ہے۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ بگن سلمہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بوا مدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بوا مدن کو اگر یہ غم تھا کہ مالکوس اور سوہنی اور بہاگ میں سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں بکا پڑ جاتی ہے۔ تو چھمو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور دیڑھ سکتا تھا۔

چھمو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاندرات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کر دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھِل کھِل کر ہنسیں،

پر بظاہر یہی معلوم ہو کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور چھمّو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ قیامت بپا ہو جاتا تھا۔

چھمّو بیگم کے وعظ بہت ماڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کبّن صاحب بلکہ خود قبلہ جارچوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات انگریزی فلسفہ کے واقعۂ شہادت میں سے نہ نکال سکتے جو چھمّو صاحبہ پل کی پل میں دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس ــــ جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصّے کیے" ــــ والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمیکس تک پہنچتی تھیں کہ اے بیبیو! ــــ جناب عباسؑ نے کہا بالی سکینہ اُٹھو ــــ" تو چھمّو بیگم نے سماں باندھ دیا، ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیلؑ کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سُنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالتمآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں ــــ" بیبیو! ــــ میں کوئی مورخ، کوئی تاریخ داں، کوئی فلاسفر نہیں ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخ اوّل پر اُتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالتمآبؐ کے لیے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔" خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں ــــ" اے بیبیو ــــ یہ جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سُنو اور کان کھول کر سُنو۔ کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے ذریعہ ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنہ بیبیو ــــ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ ربِ ذوالجلال کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

ــــ یہ دن کیا ہے ــــ؟ وَن انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ــــ" مسئلہ توحید سے سلسلۂ کھینچ کر پھر واقعۂ کربلا اور شہادت علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔

یہ چھمّو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب بڑی بھاوج پیدا ہوئیں۔ بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جون پور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا۔ جس میں شادی بیاہ، تیج تیوہار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے، جوگی رم پورے کی سالانہ زیارت، غرض کہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو فرلانگ تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے۔ اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ اُن کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ بھرا پُرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے اُن کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصّہ دراصل امام باڑے والے آمھلی کے باغ سے چلا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ دونوں گھرانوں میں بول چال تک بند ہو گئی۔ سچ کہا ہے بُوا کہ زر، زمین، زن تین چیزیں گھروا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضع داری پر حرف نہ آنے دیا۔ اور مرنے سے پہلے دیورانی سے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروا لیا۔ اس پر بھی کینے والوں کا بھن کس نے منہ بند کیا ہے۔ محلے میں ____ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے غلّے کی کوٹھری میں سونے کی مہریں دفن کیے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اُوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ سال دو سال کے اندر اُڑا دیا۔ بلکہ بُوا مدّن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمو بیگم کا ہے۔ جو ادھر کی اُدھر لگاتی تھی اور پھر سال کے سال

منبر پر مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھمّو بیگم جیسی کٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بوا مُدّن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گلِ زہرا کو فدائی ــــــ نو ماؤں نے دیکھی درِ خیمہ سے لڑائی ــــ ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ــــــ اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے۔ جی ہاں ــ ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہوا کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال، روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر تی گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی ساری نٹنگ کے نمونے اس کو آ دیں۔ جہاں پر وہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانہ پڑھنے کی وہ شوقین۔ نیاض علی کی انور و نسیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی۔ سی۔ ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔

کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے رواوار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں زرا کی زرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دون کی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چائے پر گیا لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے کسی کو بدنام ہوتے دیر نہیں لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا، کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں، مرادیں مان رکھی تھیں۔ عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اُس کے کان سے منہ لگاکر ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا! کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کی سال کھُلے۔

اب یہ پوچھو کہ میاں اعزاز کے پلّے باندھنا نصیبے کا کھُلنا سمجھا جا رہا تھا لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر انکار کر دے گی۔ برات میں ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھُٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے۔ "ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی!"

۵

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن دل کے بڑے پکّے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دے دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دُکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دُنیا بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹنٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بہ یک ایک نیا رنگ آگیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے آنے پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا۔ کہاں گئی موٹر سہ کار می بیچا کر سبزی ترکاری، وہ بھی

دیکھا، یہ بھی دیکھ ——— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سُن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکّے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انھیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال کہ جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں۔ صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔ "باعزّت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گذر جاتی تھیں۔ مسلمان بیبیوں کا دن دھاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جارہا تھا ——— اب کے وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لیے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال ہیلا وڈیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی سپتریاں اس وش وڈیالے کی ودّیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جون پور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اتروانے آ گئے تھے اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبّے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا کا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

۶

"کھیم وتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد بسنتٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی ـــــ وہ چودھری سلطان کے لیکچر سُننے جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ـــــ" کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ اور پھر وہ خاموش ہو گئی ـــــ اور کھڑکی باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے۔

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے۔؟" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ـــــ "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سایے میں رہے، ایک مٹّی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنے مشترکہ کلچر پر ناز تھا ـــــ چار سال بعد جب اس وقت کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودّیالیہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ میں کٹّر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہو گئی۔ بنو اچھے کرو بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری یہی ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے

چھو کے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ——" کشوری چپ ہو گئی۔

آتش دان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چائے پر گئی تھی" ارملا نے کہا۔" وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے مجلس میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری؟" —— کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سکریٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے۔ اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروا لیں —— پام دت وغیرہ سبھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا۔"

"سوریہ است ہو گیا —— سوریہ است ہو گیا ——" دوسرے کمرے میں "میلے" کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"—— میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں —— اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔" ہم عصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ دارالعلوم میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں ——" کشوری نے کہا۔

"چاروں اور آگ لگی —— دل میں بھوک پیاس جگی —— یگ یگ ہم گاتے۔ ہم گاتے ہم گاتے ——" لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں ـــــ" اُس نے ساتھیوں کو اُداس آواز میں مخاطب کیا۔ تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اور اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گزرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے" روزماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں۔ جون پور میں، میرے محلّے میں، بچے کچھے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سامنے بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرّم کا زمانہ گزر گیا ہو گا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ـــــ کشوری نے دل میں کہا۔

"برف باری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم، اتنے بے مصرف ہیں ـــــ؟" روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

"نہیں ـــــ" کشوری نے کہا۔

"پگ پگ ہم گاتے چلیں ـــــ" لڑکیوں کی ایک آواز نے تکرار کی۔

۷

چارباغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم لینے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول پھر چاند باغ۔ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہاسبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آ جاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش، مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہو گی۔ نہیں ہو گی۔ ہو گی۔ نہیں ہو گی۔

یونی ورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شوڈاؤن" کے لیے اسٹیج

اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا:

"آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شُدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے ان قوموں کو آزاد ہونا ہے جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔"

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونی ورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ——" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا۔ "کل جس طرح آپ نے اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے متعلق اظہار خیال کیا اس کے لئے معافی مانگیے ورنہ ہم اسٹرائک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائک ہم نے۔ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے —— اری تُو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باؤلی سی۔ وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رُک گئے اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکھارے۔ "بات یہ ہے مس عبّاس ——" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو ——"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجیے ——" کسی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگیے قبلہ۔"

"ڈاکٹر صاحب، میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ——" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحب زادے ——" آفتاب رائے نے رسان سے کہا۔ "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ـــــ" انہوں نے شور مچایا ـــــ "معافی مانگیے۔ ورنہ ہم اور نگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور مناؤ ـــــ" آفتاب رائے نے بے حد اُکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کرو ـــــ خدا مبارک کرے ـــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا اور حقہ اُٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہاسبھائی نکلا یہ بھی ـــــ" لڑکے اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اُس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب لوگوں نے کہا ایک چُول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہو گا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جون پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا وِرد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر وقت ان کو تنگ کرتی۔ "آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟" اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔

وہ تو کشوری کے لیے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ آخری وقت بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جون پور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم۔ اے کرتی ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لیے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائیے۔ نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیسے اخباروں میں مضمون لکھیے، ریڈیو پر بولیے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اُڑ چھو ہو ——— لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں۔ آنکھوں سے سُجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں۔" بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مرجاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوزخوانی کون کرے گا۔ میرے لئے نوکی کا حلوہ کون بنائے گا۔ پُوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا۔" پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یاعلیؑ کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ——— " دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایکو ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبا دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اُسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا۔" بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں اور یہ جو بابا کی قوم پرستی تھی سارا جون پور عمر بھر سے واقف

ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجایب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دو بار دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بار بار ترس آجاتا۔ بچارے بابا!

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جارہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی سنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کردیا تھا جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لیے کہاں سے آتا۔ اور فالج تو بُرا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعہ چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروادیے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال ترک کردیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

لیکن ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے لیکن ہم شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلے جائیے گا۔

اور وہ گھوم پھر کر جون پور لوٹ آئی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا — "وہ تمہاری گوئیاں نسیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے

با اثر آدمی ہیں اور بڑے شریف ضرور مدد کریں گے۔" اور کشوری کو خیال آیا کہ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی۔ اور اُس کو سخت سُست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہی ہفتے وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے ـــــ اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اُڑتی اُڑتی سنی تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جُرم میں ان کو احمد آباد جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ جیل سے چھوٹے تو کچھ اور گڑ بڑ ہوئی اور اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت یہ تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت جی کی بالکل موبخھ کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک لمبی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال صاحب تو عرصہ سے گویا مستقل "زیر زمین" تھے۔

بچارے آفتاب رائے۔

آج چاندرات تھی۔ محلّے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اُترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آکر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بے دلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پہ بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر اُدھر چل رہی تھیں۔ اب وہ اللّے تللّے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہارنیں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس نگوڑی مولہ رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پار مار گیا تھا۔ لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری۔

"آگئیں چھمّو ـــــ آؤ جم جم آؤ۔"

چھمّو بیگم چپ چاپ آ کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کر تعزیوں کو جُھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔ "مولا! یہ آخری محرّم ہے۔ ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی۔" اور یہ کہہ کر

انہوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مدن اپنی پرانی "دشمنا گی" فراموش کر کے سر ک کران کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ــــ "لو بوا غمِ حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائے گا۔ مولاؑ تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ــــ"

"ہاں۔ ہاں ــــ" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ــــ

"مولاؑ کیا پاکستان میں نہیں ــــ تم وہاں مولاؑ کی مجلسیں قائم کرنا۔"

"لو بوا ــــ ہم بھی چل دیے پاکستان ــــ" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھوٹو بیگم چاندرات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدّن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مدّن ــــ" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیوی چل دیے ہم بھی ــــ" بوا مدّن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ــــ؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ تو نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ سب فضیحتوں سے الگ۔ سارے دلدّر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر۔

"بس بڑی بھاوج کا لڑکا نہیں مانتا ــــ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آجاؤ ــــ کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔"

"اچھا ــــ شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ــــ" بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب ہیلے۔" بوا مدّن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی تھیں۔ دوبارہ غلط مشورہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ گھّن نے آواز ملائی ــــ چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم ساز رو اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت آمیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اُس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرمیٹک آرٹ جا کر یوگرفی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویر، اینتھنی السیکویتھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کو تو وہ دفتر سے نیٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو بات صاف کہتا تھا کہ بھائی میں انٹی لکچوئیل وئٹلکچوئیل نہیں ہوں۔ سیدھا سادا آدمی اور جس ڈھرے پر سن بینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے۔ انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی خاتون تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اُٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سُنہرے دنوں میں خیر وہ یوں ہی جھیسٹ میں انٹلکچوئیل بن گئی تھی کہ یونیورسٹی کی زندگی کا یہ ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گا بڑ ولی ہری

"سوریہ است ہو گیا ___ سوریہ است ہو گیا___" ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی ۔ "کنول دیدی ___ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ۔"

"ہاں ہاں بھئی ___" کنول نے جواب دیا۔ "اور وہ میری کتاب تو دیتے جاؤ۔"

"ارے ہائے ___" ارملا نے رُک کر کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ چھین کر لے گئے۔ کہنے لگے کل دے دیں گے۔"

"ڈاکٹر ___ آفتاب ___ رائے ___" کنول نے دُہرایا۔

"ہاں کنول دیدی ___" ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ "وہ تو دن بھر یوں ہی لائبریروں میں گھُسے رہتے ہیں۔ آجکل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آگئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس نظر آرہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے ___ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ___"

"گڈ نائٹ ارملا ___"

"ارے ہاں۔" اس نے جاتے جاتے رُک کر پھر کہا۔ "کل آپ رائل کمانڈ پر فورمنس میں جا رہی ہیں ___ ؟ آپ کو تو سر رالف ریڈسن نے خود ہی بُلایا ہوگا۔"

"ارے نہیں بھئی ۔" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ (یہ بھی اس کا ایک پوز ہے۔" ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سکنڈ سکریٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا۔ "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چڑیل کہیں کی) ۔ "نہیں بھئی ارملا مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں۔"

"اچھا گڈ نائٹ ۔"

"اچھی طرح سوؤ ___" کنول نے کہا۔ ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔

ابھی ان کا کوئی بھروسا تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے ——— کہنے لگے کل دے دیں گے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"واسنتھی ———" اس نے چلّا کر آواز دی ——— "کھانا گرم پر لگا دو ———"
اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سمے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتی ہو پو، موڑی چھوڑنا ——— فکر مکر بوجوئے ہو ——— اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لینٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔

میں نے کیا کیا تھا ———؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی، بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی۔ سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا، ایک روز یوں ہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہیے تھا۔ پر ہو گیا۔

"کنول ڈارلنگ" ——— ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ——— "جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ۔"
——— میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ ———؟ کنول نے سوچا تھا۔ کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ملتا ہے؟

باہر اندھیرا تھا اور سردی اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے کبھی آفتاب بہادر ——— اس نے غصّے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا۔ ——— تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے کے کسی کونے میں آکر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے لوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر ———؟

آفتاب بہادر ——— اب جو میں ہوں اور جو تم ہو ——— کیا یہی بہت ٹھیک ہے ———؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ جو آفتاب رائے کو

بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی۔ (ایک بار خود اس کے لیئے اس کی دوست ثروت نے ایک بور سے آدمی کی تصویر سامنے لاکر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ ـــــ!! اور کمال یہ کہ عین ـــــ اسی طرح کا آدمی جین نکلا ـــــ) آفتاب کی بیوی یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کرکری کھاتے ہیں ـــــ ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے لیکن فرّاٹے بھرنے اور ہوائیں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بس بالکل مجموعۂ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں، اور مجھ میں کیا بُرائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اُترنی چاہیے تھی۔ کہ یہ مہاپُرش آسمان پر سے خاص اس کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جے جے دنتی سنے۔ پوریاں بنواکر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈالے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جائیے ـــــ ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیپل کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کے باقی افراد سے کہا: ـــــ بھئی نمبر ۲۹۔ اے۔ پی۔ سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے۔ اگر بھائی آفتاب چاء پیتے پیتے رک کے دفعتاً کنول رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو تمہاری کنول رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پرو پوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا مہی پال کو فون کردو کہ آم خریدتا لائے یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی۔ وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کرکے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی، اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلا وطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی

تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پر فورینس اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال ہے اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی ہے لیکن تم بھلا سوچو گے۔ (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اترتا ہے) کیا اُلٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمھاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمھارا مطلب کیا نکلا۔ واہ چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کردی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں' اے عزیزو کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا، وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے۔ بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کُھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹری چمک رہی تھی۔ جی ہاں۔

اری ثروت ــــــ کُروک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جاسکتا تھا لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ (یا VICE VERSA۔)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ مکرجی کی طرح مہاگرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا ــــــ (وہ کون ہو گی ــــــ کیسی ہوگی ــــــ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا۔ (بہت سے لوگوں کے لیے اس میں بھی سخت گلیمر تھا) ــــــ کیا بات ہے صاحب ــــــ ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ــــــ اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی،

بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا ادھر ادھر خواتین سے بھی مل لیے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا ــــ بیچاریاں ــــ! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویّہ قائم رکھا ــــ (یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا۔) اچھا بھئی آفتاب بہادر ــــ تم کتابیں لکھتے رہو۔ میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ــــ زندگی تمام ہوئی ــــ نچلی منزل میں ارملا ہربندر ناتھ چٹوپادھیا کا وہ کم بخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کہرہ اب کم ہو گیا تھا۔ اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لیے مڈنائٹ ماس کے لیے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

صبح ہوئی شام ہوئی،
زندگی تمام ہوئی،
زندگی تمام ہوئی،
زندگی تمام ہوئی،

۹

"جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے اور ابھی میں راستے ہی میں تھی جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے۔" کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چٹخ سے آتش دان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں

منہمک ہو گئی۔

"آج مڈ نائٹ ماس منانے جائیں گے" روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا "چلو ہم برومپٹن اوریٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اُداس چہرے والی ایک ہینگرین پناہ گزیں لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھنٹوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابل رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کر "آزادی کا شکرانہ" کردیا —— آج کی رات میں وہاں امید اور نا امیدی کی اس کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی"۔

کتنی کیفیتیں جنھیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لیے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

"تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں" کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر سبھی کو خوشی ہوتی ہے" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی —— "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی —— آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔ "ارے کھیم —— کھیما" میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کھیما رانی تم ہم کا نا ہیں چینہیں۔" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا جو اس کی اور میری مادری زبان تھی —— "ہلو کشوری —— " اس نے منتقل کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے۔

اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ "یہ میرے پتی ہیں۔" کھیم نے اسی سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ "نمستے بھائی صاحب ـــــ" میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے۔" کھیم نے بڑے طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری طرف دیکھا۔ اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ـــــ "اچھا بہن جی ـــــ اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آئیے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں ـــــ" "اچھا ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم۔" میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی۔ میں نے اُسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی کہ میرے رفیقو! انسان نے خودکشی کرلی۔ پُرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہوگئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دُہراتے دُہراتے تم لوگ اُکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومنٹک تصویر لیے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہوگئی۔ میں نے اور کھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی جو تم کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو، سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روز ماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔" اس نے روز ماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی؟

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک سرد لڑائی کے محاذ پر اسے اپنے اور دُنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے

"ہم لوگ یونی ورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہیے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے میلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

" تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ___؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ___؟؟"

وہ خاموش ہوگئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلے کو دیکھتے رہے۔

سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں "وائٹ کرسمس" گائی جا رہی تھی۔

" شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ___" ارملا نے نیچی آواز میں کہا ___ " کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے سُنا تھا کہ آپ ری پبلک لمپی ڈوزا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سُنا تھا ___ انہوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ___ میں نے سوال کرنا چاہا۔ ہاں ___ میں بھی ___" اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہوگئے اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراؤنڈ نے اُن کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ اتنا عرصہ انھوں نے کیسے گزارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انہیں کب ملے گی کیا ہوگا ___"

دور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہوگئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آگئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا ___ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے یہ جھیلیں۔ یہ بات۔ ہمارے منتظر

ہیں۔ سنّاٹے ہیں، صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن ہم اُسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزبیتھن وضع کے مکان میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی ہائی کمیشن کے فرسٹ سکریٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انہوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ ان لیمپوں کے نیچے گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آرہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور اُن کے خیالوں کے بھٹکنے ــــــ؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ــــ آؤ ــــ آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفّارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خُدا کی آواز ہوں۔ اور تمہاری ہر تنہائی میں شریک ہوں اور موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا جو اپنے ملکوں سے جلا وطن ہو کر اس وقت خداوند قدوس کی تقدیس کرتے تھے۔ اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاست داں راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ اس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہدنامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہدنامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے —— آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سُروں کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ آہستہ اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنول رانی —— کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آجاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہدنامے منسوخ ہوئے"، کشوری نے آہستہ سے دُہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ رہیں گے۔ ہم یوں آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گئی۔ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل —— ہے —— ساری دُنیا کی نئی تخلیق ہے۔"

لیکن کنول کماری! —— تم اب بھی رو رہی ہو۔؟

قرۃ العین حیدر

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ حدِ نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے۔ دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زنّاٹے سے گزرتی جاتی تھیں۔ ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکر مند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص، چالیس سال کے لگ بھگ عمر، متبسم پُر سکون چہرہ، ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی، ایک باتصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر سامنے والے پُر کشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی ادق اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارویجین یا ہینگرین، یا ہو سکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دُنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کون سی زبان ہے، اس خوبصورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے باتیں کرتے سُنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے۔ وہ اپنے شہر ٹورانٹو میں چند ایرانی طلباء سے مل چکی تھی۔ چلو یہ تو پتا چل گیا کہ یہ فیبولس گائے (FABULOUS GUY) پرشین ہے (اس نے انگریزی میں سوچا میں آپ کو اُردو میں بتا رہی ہوں کیونکہ افسانہ بزبانِ اُردو ہے۔)

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا آہستہ سے کہا۔

"یہ دُنیا واقعی خاصی خوبصورت ہے۔"

یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا، لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوبصورت ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینیڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اُداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔ "ڈیڈ! اب آرام کرو۔"

اس نے جواب دیا۔ "ایڈنا۔ میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کی بیٹی نے رسان سے کہا۔ "اچھا۔ اس کے بعد ذرا سو جاؤ۔"

اس کے بعد وہ آ کر کینیڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ گو انگریز تھی مگر شاید اپنا دُکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

"میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں۔ پروفیسر چارلس ہنٹ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمھارا فیلڈنگ ٹورانٹو۔ کینیڈا۔"

"کیمبرج انگلینڈ۔ ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے۔"

"بیمار ہیں۔"

"سرطان۔ اور انھیں بتا دیا گیا ہے۔" ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"او۔ آئی۔ ایم سو سوری۔" تمارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم میں داخل ہو جانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

"اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے۔" ایڈنا نے آہستہ آہستہ سے کہا "کہ یہ دُنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لئے چھوڑنی ہے تو جانے کیسا لگتا ہوگا۔"

"اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہو جانا چاہیئے۔" تمارا نے کہا اور خفیف سی ہنسی۔

"حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جیسے اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔" تمارا نے کہا۔

ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔

اس بے تکلف کینیڈین لڑکی نے بات جاری رکھی "میں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں۔ میری والدہ کے دو ماموں، ایک خالہ، ان کے بچے۔ سب کے سب۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری کی چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیر لیتی ہیں۔"

"اوہ۔"

"حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔"

"اوہ۔ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے۔"

"میرے نانا روسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جا کر تعصب سے بچنے کے لئے بدل کر فیلڈنگ کر لیا، لیکن میں"۔ اس نے ذرا جوش سے کہا۔ "میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں۔۔۔ تمہارا گرین برگ فیلڈنگ۔"

"واقعی؟" برطانوی خاتون نے کہا۔ "کتنی دلچسپ بات ہے۔"

"اولادِ آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔" تمارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیّر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو۔ "میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔" لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود بھی مسکرائی۔ اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجئے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کر لیں گے۔ کیونکہ اولادِ آدم کی باہم کشش کا عجیب گھپلا ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"میرے نانا جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے۔" تمارا نے آہستہ سے کہا۔

"کوران ——؟" ایڈنا نے تعجب سے دُہرایا۔

"ہاں۔ وہ موزلم تھے اور میری نانی، ممی کو بتاتی تھیں، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے، دُنیا بہت خوبصورت ہے، اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو خوش رہنے دو۔ اور شاید موزلم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دُنیا نہیں ہو سکتی۔" سگریٹ سُلگانے کے لئے تمارا نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جُھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سُہانے منظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ "یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چند روز بعد دُنیا سے جانے والے ہیں انھیں جانے کیسا لگتا ہو گا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہو جائیں گے۔ یہ دُنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔"

ایرانی نما شخص دردمندی سے مسکرایا۔ "جس انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے مُنہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔"

"واقعی؟"

ہم سفر نے اپنا نام بتایا۔ دکتور شریفیان تبریز یونیورسٹی۔ شعبہ تاریخ کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے بشاشت سے دریافت کیا۔ "این۔ آئی۔ کیو یعنی نُو۔ آئی۔ کیو؟"

"نصرت الدین امام قلی۔"

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رُکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اُسی جگہ سُرعت سے اُتر گیا۔ دکتور شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ بارش ہو چکی تھی۔ درخت۔ پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ اکّا دُکّا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چُپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر دونوں خواتین پیش کیے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گذر چکا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اُس کی فربہ بیٹی اپنی باہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کنیڈین لڑکی سے کہا——
"تمارا خانم کہاں تک میرے ساتھ رہو گی؟"

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی تھی۔ کہاں نامعقول ٹم! اور کہاں تمارا خانم جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا۔"جہاں تک ممکن ہو"
بہرحال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔
"تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے؟"
"پڑھنے۔ بایو کیمسٹری۔ مجھے اسکالر شپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو۔"
"صرف چند روز کے لیے۔ میری دانش گاہ نے ایک ضروری کام بھیجا ہے۔"
ٹرین قرونِ وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے۔ کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے۔ دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔
"بڑا خوبصورت شہر ہے۔" تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی

تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

ڈکتور نصرت الدین ایک پُر مذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے اسے ہنستا رہا۔ تمارا نے اُسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا۔

"خانم جُون!"

"ہوں؟ جُون کا مطلب؟"

"زندگی!"

"ونڈر فُل۔ یعنی میں تمھاری زندگی ہوں!"

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا "ہاہا۔ میری زندگی! سنو خانم جُون ۔ ایک دل چسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو۔"

"بہت خوب۔ آپ سے زیادہ با اخلاق شخص پورے یورپ میں نہ ہوگا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں!"

"واللہ۔ کسی روز تمہیں اُن کی تصویر دکھلاؤں گا۔"

دوسری شام وہ اس کے ہوسٹل کے کمرے میں آیا۔ تمارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کرکے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

"بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھ دار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔" اس نے آتش دان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی سامان اُٹھا کر ایک طرف رکھا۔

"لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے سب سے خوبصورت لڑکی چھانٹ لی۔"

"چھانٹ لی۔ عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!" تمارا نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتّے سرسرائے۔

"وہ بھی عجیب عیاش بزدل ظالم قوم ہے۔" تمارا نے مزید اظہار خیال کیا اور ایک

الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں پروفیسر کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انھیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں۔" نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

"کاکروچ کھاتے ہیں؟" تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔ "وحشی۔ بدّو۔ مشرقی۔ معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ تم تو اُن سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں۔" اس نے ذرا خجالت سے اضافہ کیا۔

"درست۔ متشکرم۔ متشکرم!"

"ترجمہ کرو۔"

"جی۔ تھینکس۔" اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ "تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔"

"واقعی؟ بہت جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔"

"کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے۔"

"بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد۔"

"فرہاد کون؟"

"تھے۔ ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ۔" اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسر والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہو، اس راستے کا نقشہ سمجھایا جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کے دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کوہِ بے ستوں کا جغرافیہ اس کنیڈین دانش جو کو ذہن نشین کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اُتار کر کرسی

پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے سارے میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دُہرایا ہوا ڈراما دُہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈراما کھیلا جارہا ہوگا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصّہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا "تمارا خانم اب وقت آگیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں"

وہ سُرخ ہوگئی۔ "معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں"

"معلوم ہے" اس نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ لیکن اس کے لہجے کی خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدّت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق اُلٹ کر اُسے پیش کیا۔

ایک بے حد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاور میانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنترے کے درخت تھے۔

"دادی اماں۔ اور یہ۔ ہمارا سنتروں کا باغ تھا"

تمارا نے دیکھا دادی میں اس سے بہت سی ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے"

تمارا نے سینڈل اُتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لیے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا "اتنے نازک چھوٹے پیر۔ تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو"

"ہوں تو سہی شاید"

"کون سا؟ ہز میجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا یا دادا اس وقت سوئٹزرلینڈ کے کون سے قصبے میں پناہ گزیں ہیں؟"

"میرے والد ٹورانٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں" تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ دکتور شریفیان کے چہرے پر سے گزر گیا۔ "لیکن میرے نانا غالباً خوانین

کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔"

"اوہو۔ خوانین کریمیا! ___ حاجی سلیم گرائی۔ قرادولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی۔ محمود گرائی۔ کون سے گرائی ؟"

"نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے اُستاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتہ نہیں۔ کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اس وقت تم سے سُنے ہیں۔"

"اور موصوف تمھارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔"

"ہاں وہی پرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہوگئے اور ریستوران کے مالک کی خوبصورت لڑکی روزلین سے شادی کرلی۔ اور روزلین کے ابا بہت خفا ہوئے کیوں کہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کیے تھے۔" وہ دفعتہً چُپ ہوگئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گزرا جسے نصرت الدین امام قلی نے نہیں دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "روزلین کے والد واقعی بہت خفا تھے۔ جب روزلین اُن سے فخریہ کہتیں کہ انھوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے۔ 'آج کل ہر چیتھڑ قنات کوچوان سائیس' خاکروب جو روس سے بھاگ کر یہاں آرہا ہے' اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا۔ تمھارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خاندان کا چوبدار رہا ہوگا، نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہوگیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انھیں کھا گیا۔"

اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گزرا جسے تمارا نے نہیں دیکھا___

"میری ممّی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ممّی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کرلی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کرکے امریکہ آگئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممّی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔" ___ نصرت الدین نے

آہستہ سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "فی الحال تمھاری قومیت کیا ہے؟"

"کینیڈین۔"

ایرانی پروفیسر نے شراب گلاسوں میں اُنڈیلی اور مسکرا کر کہا۔ "تمھارے نانا اور میری دادی کے نام۔" انھوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرا ہفتہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی طرف جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے۔ اچانک وہ کھلونوں کی ایک دوکان کے سامنے ٹھٹھک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

"تمھارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین؟" تمارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مُڑا اور سادگی سے کہا۔ "میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری محبوب بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے اور اُس کا منگیتر میرے بڑے بھائی کا لڑکا۔ وہ دراصل ٹسٹ پائلمٹ ہے۔ اس لیے کچھ پتہ نہیں۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔" وہ خاموش ہو گیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا

اس نے آہستہ سے خوددار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے، کہا ـــــ "تم نے بھی بتایا نہیں۔"

"تم نے بھی پوچھا نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنکی انسان تھا۔ کوہ بے ستون کے پتھر وں سے ترشا ہوا مجسّمہ۔

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی۔ وہ اسے مغرب کی (PERMISSIVE) سوسائٹی کی ایک آوارہ لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس کی سچے دل سے عاشق تھی۔ اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین تمارا سے کہا ـــ

"ہلو خواند خاتون۔"

"کون؟"

"علاء الدین کیقباد دوم کی ملکہ۔"

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم۔ کبھی اُسے ساقی بیگ کہتا۔ "کیونکہ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فی صد تاتاری خون تو ہے ہی۔ اور سُنو۔ فرض کرو۔" ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا۔ "اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے۔ وہیں کسی خان زادی سے شادی کرلی ہوتی اور تمہاری آماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشاہ سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہر خانم ہو سکتی تھیں۔"

دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "تاریخ، نسل، خون، کس کا کیا قصور ہے؟" وہ بہت بے رحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔ "چلو بی بی جون۔ گھر چلیں۔"

"گھر؟" اس نے سر اُٹھا کر کہا۔ "میرا گھر کہاں ہے؟"

"تمہارا گھر ٹورانٹو میں ہے۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔" نصرت الدین نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں اُمید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پُرسکون نہیں۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ "میرا گھر کہاں ہے؟"

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارسی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں اس نے کہا۔ "آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں۔"

"ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لیے مونٹریال آؤ۔ یا یو۔ این۔ اے میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔"

"اور تم کسی امریکن کروڑپتی کی فربہ بیوہ ہو۔"

"ہاں۔ اور نفتی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا

ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں ؟"
"پیرہ زن ۔"
" اور عربی میں ؟"
" مجھے عربی نہیں آتی ۔ ترکی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں ۔"
" سُنو نصرت الدین ۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے ۔"
"کیا ؟"
"جب میں اس امریکن کروڑ پتی سے شادی کروں گی ۔"
" جو بوجہ السر تمہیں جلد بیوہ کر جائے گا ۔"
" ہاں۔ لیکن اس سے قبل ایک بار۔ صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے ۔ تبریز۔ اصفہان۔ شیراز ـــــ میں وہاں پہنچ کر اپنے اس نامعقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی ۔ ضرور بالضرور ۔"

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔" بعض دفعہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی ۔ وہ بھی تمہاری طرح ۔ تمھاری طرح اپنے ابنِ عم کو اس شدّت سے چاہتی ہے ۔" وہ پھر ملول نظر آیا ۔
" آغا۔ تم مجھے اپنی بنتِ عم سمجھو ۔"
" تم میری بنتِ عم ہو تو سہی ۔"
" کیوں کہ ہم سب اولادِ آدم ہیں ۔ ہے نا ؟"
" اولادِ آدم۔ اولادِ ابراہیم ۔ آلِ یافث ۔ آلِ اسحق ۔ آلِ اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجرۂ نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمارا خانم لیکن اب کھانا شروع کرو ۔"

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی ۔ اور بولی ۔" میں نے آج تک ایسی خوبصورت ناک نہیں دیکھی ۔"
" میں نے بھی نہیں دیکھی ۔" شریفیان نے کہا ۔
" آغا۔ تم میں نرگسیت بھی ہے ؟" تمارا نے پوچھا ۔
" ہے ۔" وہ شرارت سے مسکرایا ۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دُعا یاد آئی جو برٹینی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔

اے ربِّ عظیم! میری حفاظت کرنا۔
میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔
اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے۔
اس نے دل میں دُہرایا۔
اے ربِّ عظیم! اس کی حفاظت کرنا۔
اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔
اور تیرا سمندر ــــــ

"آغا۔ ایک بات بتاؤ۔"

"ہوں۔"

"تم نے آج کا اخبار پڑھا، تمھارے ملک کے بہت سے دانش جو اور دانشور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انھوں نے برلن میں کل بڑا بھاری جلوس نکالا۔"

"پڑھا۔"

"تم تو جلا وطن ایرانی نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمارا خانم میں لڑکے پڑھاتا ہوں۔"

"اچھا۔ شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔"

"اچھا۔"

اس رات وہ حسبِ معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا۔" جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے میں کتنی باتیں یاد کروں گی۔ تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آکر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے۔ بتاؤ کبھی میرا خیال آئے گا۔؟"

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

"تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لیے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کم از کم سال کے سال

ایک عدد نیو ایرز کارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا پتہ بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔
اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی۔ T کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتہ لکھا اور بولی۔ وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے"۔

"میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا"۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علاحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ باریک باریک پُرزے کر کے اُن کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے تکیے سے ذرا سا سر اُٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اُٹھی نصرت میز پر ناشتہ چُننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلیفون پلنگ کے سرہانے کتابوں کے انبار پر رکھا ہوا تھا۔ اُس نے ذرا سا سرک کر ریسیور اُٹھایا اور "اَلو" کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بُلایا۔

وہ لپک کر آیا اور ریسیور ہاتھ میں لے کر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔

گفتگو ختم کرنے کے بعد نصرت نے جُھک کر اُس سے کہا "خانم جُون۔ اب اُٹھو"۔

اس نے سُستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا، قہوے کی کشتی لاکر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ قہوے کی کشتی لاکر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی۔ اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جا رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بے حد غضب ڈھایا۔ تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے

اُتری اور اُس کے قریب جاکر بڑے لاڈ سے کہا۔" آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔"

ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپوائنٹمنٹ ہے۔" اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔" جھٹ پٹ تیار ہو کر ناشتہ کر لو۔ تمھیں راستے میں اتارتا جاؤں گا۔"

ٹھیک پونے نو پر وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سُہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک بس آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔" یہ تمھارے ہوسٹل کی طرف نہیں جاتی۔ تم دوسری بس میں چلی جانا میں اسے پکڑتا ہوں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا۔" خدا حافظ۔" اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آکر تمارا نے حسب معمول اُسے فون کیا۔ گھنٹی بجی۔ وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ وہ کافی دیر میں سو کر اُٹھی۔ اُس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اُٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے اڈیشن اٹھائے سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سُرخی میں وہ خوف ناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ دکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانش گاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دُبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا۔ اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اُتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ایئرپورٹ میں ایک طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے

دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں۔ جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں، سمندر، بے تکی شکلیں، آگ اور آوازیں۔ شاید وہ CLAREAUDIENCE کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آیا کیں۔ جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ۔ میں نے تمھاری بات سُنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے مُنہ میں جانے والا ہے، وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا اسنگترون کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے؟

ونڈرفل۔ میں تمھاری زندگی ہوں! ہاہا۔ میری زندگی۔ جانِ من۔ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قربون۔ وقت ضائع نہ کرو۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بیچارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلو ترکان خاتون۔ میں ایسے وعدے نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں۔ تم میری بنتِ عم ہو تو سہی۔ آل اسحٰق۔ آل اسمٰعیل۔ میں بنی آدم کے شجرے کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف دُنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساقی بیگ۔

اندھیرا پڑے، پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع۔ اچانک اس کا کلوزاپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ۔ آدھا دستی بم سے اُڑ چکا تھا۔ صرف پروفائل باقی تھا۔ دماغ بھی اُڑ چکا تھا۔ ایئرپورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجا بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں۔ سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پیٹی۔ گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔ تم بہت اچھے اداکار

ہو۔ کم از کم ٹی۔ وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی، جلد تم مجھے ٹی۔ وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔

کیمرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھُٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں "نصرت الدین" کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ۔ پھر گوشت کا ملغوبہ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو اُبکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اُٹھی اور غسل خانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سُن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن کیا اور اسے فرش پر سے اُٹھانے کے لیے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا جیسے نرس آپریشن ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لِٹاتی ہو۔ یا اسے ایک ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے۔ ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھُلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد۔ کمرے کے بعد کمرے۔ ایک کمرے میں سفید آتش دان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی۔ شکل سے سنٹرل یوروپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نکلا ہو۔

ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بافی کا کرگھا۔ کرگھے پر آدھا بُنا ہوا قالین۔ اس پر "شجرِ حیات" کا ادھورا نمونہ۔

"یہ شجرِ حیات کیا چیز ہے نصرت الدین؟"

"مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔"

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں۔ پھر بہت سے پردے جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار۔ وہ پردوں کے انبار میں اُلجھ گئی۔ پھر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اُتری۔ جیسے بنک کے تہہ خانے ہوتے ہیں، چمکیلی سنگلاخ دیواریں۔ چمکیلا فرش یا جیل خانے کے کوریڈور۔

سناٹا۔ اب وہ ایک بہت وسیع سُرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اُسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اِس سُرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سُنسان کوریڈور میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لیے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے۔ کیچڑ کی وردیاں اِسے دیکھ کر استہزا سے ہنسے۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار۔ بارش ہورہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس نے قریب جاکر اس عورت کو چھوا۔ وہ عورت مُردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مُردوں کا ہجوم تھا۔ بسیں اور ٹرامیں مُردے چلا رہے تھے۔ دُکانوں میں خرید و فروخت مُردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا۔ اسٹیج پر "سوان لیک" میں مُردے رقصاں تھے اور تماشائی بے جان تھے۔

"یہ زومبی ہیں نا؟" اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"قیں قیں۔" اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ "زومبی نہیں مادموزیل۔ خالص۔ اصلی مُردے۔"

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس۔ مفلر سے سر چھپائے۔ مستقل مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سُرخ ہو جاتیں کبھی سبز۔ اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔

"اِکس کیوزمی۔" تمارا نے نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔ چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت موجود ہو۔ یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہو گئی۔ بغیر ڈرائیور بغیر مسافروں کے فرّاٹے بھرتی ایک پل پر سے گزر کر قبرستان کے پھاٹک پر رُک گئی۔

"یہ زندوں کا قبرستان ہے۔" تمارا نے اپنے آپ کو بتایا۔ اب اسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جارہی تھیں۔ میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جاکر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک SPLIT LEVEL قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی وژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی وژن پر سنہرا

یوروپین نیلے چہرے والی عورت" لِلی مارلین" گا رہی تھی۔ اس نے ۱۹۱۶ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہوگئیں۔ وہ خبریں سُننا نہ چاہتی تھی، اس لیے بھاگی۔

راستے میں اس نے دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے اُلٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔ قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا اور شہر واپس آئی۔ یہاں حسبِ معمول ہر جگہ مُردے ہی مُردے تھے۔ دفتروں میں، کارخانوں میں ہر جگہ بعض مُردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولھویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔ تابوت سے (تابوت گاڑی کو باوردی مُردے کھینچ رہے تھے۔) سلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گم سُم بیٹھ گیا اور مٹّی کے رنگ کی بُھربُھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارہویں صدی کی مُردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے مٹّی کے تھے۔

"یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جنرل لام بندی!" ایک گیارھویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ ایک عظیم الشان صومعہ فوراً اس کے سامنے آگیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر ربائی نماز عشاء پڑھانے میں مصروف تھا۔ دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں مُنہ چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا آپ حضرت ایوبؑ ہیں؟" اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

"نہیں۔ میں بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں، مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔" آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"آپ ابلیس ہیں؟"

"یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار!" اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی۔

"آپ نے ایل۔ایس۔ڈی بہت نوش جان کی ہوگی۔آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے؟"

"روح؟ روح گئی چولھے بھاڑ میں۔کیسی روح؟" میں نے جواب دیا اور بال نوچے۔

میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔اُس نے دل میں دُہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پُھلکا محسوس کیا۔وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی۔کبھی ایک دم خالی۔اس میں دُنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دُنیا میں گھوم رہی تھی۔سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر

اور سنائی

اور سُوریہ

اور

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آگئی اور بغیر پیٹریوں کے ریت پر چلنے لگی اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پڑے سُرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور ٹائیر

اور صیدون

اور نینوا

افق پر سنسان خیموں کے پردے بادسموم میں پھٹپھٹا رہے تھے۔سارے میں جلی ہوئی رسّیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچّوں کی ننھی منّی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کربناک آواز میں پکارا۔العطش العطش۔

اس کے کیا معنی ہیں۔اس کی سمجھ میں نہ آیا۔کیوں کہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی۔سوا اپنی زبان کے۔میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔میں وہاں ہو آئی ہوں، وہاں کچھ نہیں ہے۔پرچھائیوں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔العطش۔

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔العطش۔

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہوگئی۔تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف اور بہت قریب نظر آرہی تھی۔

"آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے"۔ جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لیے اسی کیفے ٹیریا میں گئی۔ دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا جس میں "نصرت الدین" اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں۔ تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جاکر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش وخروش سے اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا)

آئس لینڈک کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں، کتنے جذبات، تصورات، نظریے، خواب، کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جاننے کے باوجود۔ منتظر لالہ کب سے۔ کانٹا، چمچے اور پلیٹ اُٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔

اس کو خونِ عرب سے۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اُٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

اتر پردیش اردو اکادمی

کی

ایک اور اہم پیش کش

تذکرۂ ریختہ گویاں

مولفۂ

علی الحسینی گردیزی

(نسخۂ ندوہ لکھنؤ مکتوبہ ۱۱۷۴ھ ہجری مطابق ۱۷۶۰ء)

مرتبۂ

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

آفسیٹ طباعت

قیمت -/۲۶ روپے

اُتّر پردیش اُردو اکادمی کی شائع کردہ

یونی ورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

منتخب غزلیں		۷/-
منتخب نظمیں		۶/-
انتخاب افسانہ		۵/-
انتخاب نثر (حصّہ اول)		۴/۵۰
انتخاب نثر (حصّہ دوم)		۵/-
انتخاب منظومات (حصہ اوّل)		۳/-
انتخاب منظومات (حصہ دوم)		۴/۵۰
انتخاب مراثی		۹/۵۰
انتخاب قصائد		۵/-
بکٹ کہانی	مرتبہ نورالحسن ہاشمی	۲/۵۰
انارکلی	امتیاز علی تاج	۹/-
ابتدائی اردو	حکم چند نیّر	۸/-
لازمی نصاب	"	۵/۵۰
انتخاب غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۵/-
انتخاب خطوط غالب		۴/۵۰

ملنے کا پتہ:

اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ

فون: ۲۹۵۱۹۲

اترپردیش اُردو اکادمی

کے زیر اہتمام

انتخاب کلام ظریف

مُرتّبۂ

سیّد عبدالباری

دوسرا ایڈیشن آفسٹ طباعت

(لاگت سے بھی کم قیمت میں)

قیمت: گیارہ روپے

INTIKHAB-E-AFSANA

Rs. 11/=

PRINTED AT : NORTHERN OFFSET PRESS, Lucknow Ph. 0522-240858 419790